اہل قلم کی شوخیاں

مرتب: عطش درانی

میری لائبریری

221

قیمت 22.00

اہلِ قلم کی شوخیاں

میری لائبریری
(۲۲۱)

ابوبکرؓ صدیق اکبر —— مصنف : محمد حسین ہیکل

یہ کتاب صاحب رسول ثانی اثنین حضرت ابوبکرؓ صدیق اکبر کے مقام و مرتبہ، عظمت و شوکت، سوز و گداز اور یقین و ایمان کا پہلا شایان شان تذکرہ ہے۔
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اگر میں اللہ کے بعد کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔
یہ کتاب دنیا کے تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے کتاب کا ترجمہ بھی بڑی محنت سے کیا گیا ہے۔

عمر فاروق اعظم —— مصنف : محمد حسین ہیکل

یہ کتاب حضرت عمرؓ کی شخصیت اور کارناموں کی چہرہ کشائی میں بے نظیر ہے۔ مصنف کی بالغ نظری کا نمونہ اور نہایت فاضلانہ ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کے نقطۂ نظر کی صحت ہے۔ ہماری تاریخ کے فاضل ترین بزرگ نے تو تاریخ نویسی کا حق ادا کیا تھا۔ مترجم حبیب اشعر مرحوم نے بھی ترجمہ میں مثال قائم کی ہے۔

اہلِ قلم کی شوخیاں

مرتب عطش درّانی

مکتبۂ میری لائبریری لاہور ۲

جملہ حقوقِ اشاعت دائمی بحق مکتبہ میری لائبریری محفوظ

ناشر: بشیر احمد چودھری
ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع: آر۔ زیڈ۔ پیکجز Lahore لاہور

سالِ اشاعت :- ۱۹۸۶ء

شُرکائے سخن

سخنورانِ قدیم۔
میرزا غالب۔
اکبر الٰہ آبادی۔
سر سید احمد خاں۔
علامہ اقبال۔
مولانا ظفر علی خاں۔
جگر مراد آبادی۔
فراق گورکھپوری۔
جوش ملیح آبادی۔
کنور مہندر سنگھ بیدی۔
اسرار الحق مجاز۔
سعادت حسن منٹو۔
مجید لاہوری۔
حفیظ جالندھری۔
کنہیا لال کپور۔
متفرقات ردو جدید

اُن کے نام

جو حقیقت کے تلخ گھونٹ پی کر بھی مُسکرانا جانتے ہیں !!!

ہاں ! تو پھر دکھائیے بتیسی !

اور نہیں .... تو زیرِ لب ہی سہی !

مقدمہ عدالت میں !

یہ ہر کتاب کا مقدمہ لکھنا بھی بس فرض ہو کر رہ گیا ہے' بالکل نماز روزہ کی طرح — کوئی کہے بھلا ! اگر مقدمہ یا دیباچہ نہ لکھا تو کونسی قیامت آجائیگی ؟ — پر کیا کیا جائے ؛ ہم ٹھہرے قوم برادری والے' کٹ کے کہاں جائیں ؟ اور پوری قوم ہے کہ مقدمے بازی میں لت پت' ادھر پتا کھڑکا' اُدھر مقدمہ دائر —— فیصلہ ہو نہ ہو' انکی بلا سے' مقدمہ ضرور چلے گا۔

پھر اس پر بس کہاں ؟ اکثر لوگ بڑے دُھوم دھڑلے سے وکیلوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں —— اور پھر ! یہ پیشہ ور لوگ منصف کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے' اپنی چرب زبانی' شیریں مقالی اور دلیل و دلائل کے ذریعے ایسی تمہید باندھیں گے' ایسی فضا بنائیں گے کہ منصف صاحبان اِن کے دھوکے میں آکر اصل کو پرکھنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے چُپ چاپ فیصلہ دے ڈالیں گے۔

کچھ یہی حال کتابی دنیا کا ہے' پیشہ ور "مقدمہ باز" یا دیباچہ نگار قاری کو ایسے ایسے ہتھکنڈوں سے رام کرتے ہیں کہ تو بہ ہی بھلی' کتاب میں خواہ مزا آئے نہ آئے' دیباچہ کا نون مرچ متن کو ایسا مسالہ دار اور چٹپٹا بنا دیتا ہے کہ قاری اِن چٹخاروں میں کھو کر یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا —— کہ —— اصل مواد اسکی صحت پر کیا اثر ڈالے گا ؟ مرچ مسالوں سے تو ویسے بھی ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے' اس پر ہم نے سوچا کہ

کیوں نہ آپ کے مقدمہ لکھنے کی بجائے داڑ کر دیا جائے ؟

سوجناب والا ! عرض یہ ہے کہ یہ شوخیاں معصومیت اور انسانیت کا ایک حصہ ہیں، پھر ان سے مسترتیں اور قہقہے بھی تو جنم لیتے ہیں، اور یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ایک قہقہہ تو تولہ خون بڑھتا ہے ———

ہمیں اپنے قارئین کی صحت عزیز ہے اور وہ ہمارے منصف بھی تو ہیں۔!

پس ہم نے اپنے کچھ ادیبوں اور شاعروں کی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی کچھ شوخیاں جمع کر دی ہیں کہ حقیقت بھی رہے اور لطافت بھی ———

سرحد پار کے اُردو اہلِ قلم کو تو ہم نے تقریباً بھلا ہی رکھا ہے، کیا خیال ہے؟ اگر چلتے چلتے ان کے ساتھ بھی چند شوخیاں ہو جائیں تو ؟

خیر ہم نے مقدمہ داڑ کر دیا ہے، آگے آپ جانیں، اور ہاں! یہ مواد بھی یوں ہی تو نہیں آگیا اپنے چودھری بشیر احمد صاحب کی بڑی صاحبزادی شہناز ہمایوں صاحبہ ایسا خاصا ذخیرہ رکھتی ہیں اور پھر مجھے انتخاب کرنے میں بھلا کیا مشکل تھی، اس لئے ان دونوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۶۷۔سی = گلبرگ = لاہور — عطش دُرّانی

سخنورانِ قدیم

اگلے وقتوں کے سخنوروں کے ہاں طنز و مزاح و بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ پھبتیوں اور ضلع جگت کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔ ان میں سے میرزا سودا ہجو گوئی میں بڑھے ہوئے تھے۔ ایک بار سید انشاء نے یہ غزل پڑھی ؎

بھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

نوجوان انشاء نے جب یہ شعر پڑھا ؎

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

اس وقت سودا جو عالم پیری کے باوجود مشاعرے میں موجود تھے مسکرا کر بولے۔ "دریں چہ شک؟"

نواب آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب صاحب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا ہے۔ سودا باوجودیکہ ہمیشہ انعام و اکرام کے انبار وں سے زیر بار تھے، فوراً کہا ؎

یارو! یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو خبر ہوئی تو بُلا بھیجا اور شکایت کے لہجے میں کہنے لگے
" مرزا تم نے ہم کو شیر خدا کا قاتل بنا دیا ؟
ہنس کر کہا " جناب عالی ! شیر تو اللہ ہی کا تھا ، حضور کا نہ فدوی کا "

خواجہ میر درد کے ہاں ایک خاص محفل ہوا کرتی تھی۔ اس میں خواجہ صاحب اپنے والد کی تصنیف " نالۂ عندلیب " اور اپنے کلام کا کچھ حصّہ بیان کیا کرتے تھے، ایک بار سودا سے ملاقات ہوئی، خواجہ صاحب نے آنے کی دعوت دی، سودا چہک کر بولے " صاحب ! مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوّے کائیں کائیں کریں اور بیچ بازار ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے "

میر تقی میر عموماً پھبتیاں کسا کرتے تھے، جب انہوں نے تذکرہ " نکات الشعراء " لکھا تو ایک شاعر محمد یار متخلص بہ خاکسار نے بھی ان کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا، جس کا نام اپنے دوست محمد معشوق کنبوہ کے نام پر " تذکرۂ معشوق " رکھا۔ محمد معشوق کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی، میر صاحب نے ان پر پھبتی کستے ہوئے کہا۔ " معشوق چہل سالہ "

میر صاحب کے ایک گہرے دوست محمد امان اللہ تھے، غریب تخلص کرتے تھے ان کی زبان میں لکنت اور ہکلاہٹ تھی اس لئے کبھی کبھی الکن تخلص بھی کرتے، جی بہلانے کے لئے اکثر باغوں کی طرف چلے جاتے اور دن بھر وہیں گذارتے، میر صاحب

نے اس کا نام "ارنڈ باغاتی" رکھ دیا۔

میرؔ سے لکھنؤ میں کسی نے پوچھا "کیوں حضرت! آج کل شاعر کون کون ہے؟" کہا "ایک تو سوداؔ دوسرا خاکسار ہے" اور پھر کچھ تامل کر کے بتایا "آدھے خواجہ میردردؔ" کسی نے کہا "حضرت! اور میر سوزؔ صاحب؟" چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "میر سوزؔ بھی شاعر ہیں؟" انھوں نے کہا "آخر استاد آصف الدولہ کے ہیں" کہا "خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔"

ایک دن سیّد انشاؔ نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی، منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب صاحب کی طبیعت میں چہل آئی، ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری، انھوں نے جلدی سے ٹوپی پہن لی اور کہنے لگے "سبحان اللہ! بچپن میں بزرگوں سے سُنا کرتے تھے، وہ بات سچ ہے، کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارتا ہے۔"

ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی آنے نہ پائے۔ سیّد انشاؔ کو ضروری کام تھا، یہ پہنچے، پہرہ دار نے کہا "آج حکم نہیں" آگے آپ مالک ہیں، یہ بھی اپنے مزاج کے تھے، تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کر کھول دستار اُتاری اور عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر ایک نازو انداز سے نواب صاحب کے سامنے جا کھڑے ہوئے، جوں ہی ان کی نظر پڑی انشاؔ انگلی ناک پر رکھ کر بولے۔

بس نرے صدقے نہ رکھ لے مری پیاری روزہ
بندی رکھے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے اور بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" اودھ اخبار میں قسط وار چھپتا تھا اور اس کی وجہ سے ان کے خریدار بھی بہت تھے۔ منشی نول کشور اس کے مالک تھے اتفاق سے سرشار صاحب نے لکھ دیا کہ خوجی نے قرولی مار کر خودکشی کرلی۔

منشی جی نے پڑھا تو گھبرائے، سرشار صاحب کو بلایا اور کچھ دے کر کچھ پلا کر خوش کرلیا۔ دوسرے روز سرشار صاحب نے لکھ دیا۔

"یہ بھی خوجی کی ایک ادا تھی جب انہیں کفنایا جارہا تھا تو وہ قہقہہ مار کر اٹھ بیٹھے۔"

آتش اور ناسخ کی معاصرانہ چشمک کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آتش کے مقابلے میں ناسخ کو ہمیشہ بادشاہ کی پذیرائی حاصل رہی، ایک روز بادشاہ کی طرف سے ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا، اس میں آتش کو دعوت دی گئی۔ لیکن جان بوجھ کر ان کے شاگردوں کو نظر انداز کر دیا گیا جبکہ ناسخ اپنے تمام شاگردوں سمیت موجود تھے، مشاعرے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جب کوئی شاعر اپنا کلام سنا چکتا تو اٹھ کر چلا جاتا، جب آتش کی باری آئی تو آثار سحر نمودار ہو رہے تھے۔ اور بزم مشاعرہ بالکل خالی تھی جیسے ہی شمع ان کے آگے آئی تو انہوں نے

اُٹھتے اُٹھتے یہ فی البدیہہ شعر پڑھا ؎

رات کو تھا آسماں پہ ماہ و انجم کا ہجوم
صبح کو خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

خدا جانے شعر میں کرامت تھی یا طلسم! آناً فاناً بادشاہ کے علاوہ اور لوگ بھی آموجود ہوئے اور مشاعرے کا از سرِ نو آغاز ہوگیا۔

ایک مشاعرے میں ناسخ اس وقت پہنچے جب جلسہ ختم ہوچکا تھا لیکن آتش موجود تھے، انہوں نے آتش سے پوچھا "کیا مشاعرہ ہوچکا" جواب ملا"جی ہاں سب کو آپ کا اشتیاق رہا"

ناسخ نے اپنے نام امام بخش کی رعائت سے یہ شعر بلا تامل پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

کہتے ہیں نواب مرزا داغ ایک بار نماز پڑھ رہے تھے کہ کوئی صاحب ملاقات کیلئے آئے، اور داغ کو نماز میں مصروف دیکھ کر اُلٹے پیروں واپس چلے گئے۔ داغ نے آہٹ سُن لی تھی، سلام پھیر کر ملازم کو دوڑایا کہ دیکھو اور معلوم کرو کہ ابھی کون صاحب تشریف لائے تھے، انہیں واپس بلاؤ۔ ملازم نے دوڑ کر ان صاحب کو روکا اور اپنے ساتھ لے آیا۔

داغ نے دریافت کیا "حضرت! یہ آپ چلے کیوں گئے تھے؟"

ان صاحب نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "آپ نماز پڑھ رہے تھے اسلئے۔"
داغ نے برجستہ کہا۔ "حضرت! مَیں نماز ہی پڑھ رہا تھا کوئی لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا"

حضرت داغ شعر کہہ رہے تھے' ان کی روانی اور برجستگی دیکھ کر مظفر خان بآرق نے کہا "خدا جانے آپ کس طرح شعر کہتے ہیں' ذراسی دیر نہیں ہوتی اور آپ شعر کہہ دیتے ہیں؟"

داغ نے پوچھا "بھئی تم شعر کس طرح کہتے ہو؟"
بآرق نے جواب دیا "حضرت! ہم تو کسی خاص وقت پلنگ پلیٹ کر حقہ سامنے رکھ کر فکرِ سخن کیا کرتے ہیں کبھی اس طرف کروٹ لی کبھی اس طرف کبھی لیٹے کبھی بیٹھے' تب کہیں کوئی شعر نکلتا ہے؟"
یہ سُن کر اُستاد داغ نے کہا "تم شعر کہتے نہیں بلکہ جَنتے ہو۔"

اُستاد ذوق نواب الٰہی بخش کے پاس بیٹھے غزل پر اصلاح دے رہے تھے جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع

کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے

اتنے میں ایک سوداگر نواب صاحب کی خدمت میں آیا' انہوں نے اسکی لائی ہوئی چیزوں میں سے ایک اصفہانی تلوار پسند کی اور استاد کی طرف دیکھکر فرمایا

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

استاد ذوق نے ایک لحظہ تامّل کیا اور پھر مصرع لگا کر شعر موزوں کر دیا۔

؎ سر لگا دیں ابروئے خم دار کی قیمت میں آج
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

ایک دن معمولی دربار تھا، استاد ذوقؔ موجود تھے، ایک شہزادہ آیا۔ اور بادشاہ کے کان میں آہستہ سے کچھ کہہ کر چلا گیا، حکیم احسن اللہ نے عرض کیا۔
"یہ آنا کیا تھا اور جانا کیا تھا" بادشاہ کے منہ سے نکلا۔
"اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے" اور پھر استاد کی طرف دیکھنے لگے، استاد ذوقؔ نے فوراً شعر مکمل کر دیا ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جرأتؔ اندھے شاعر تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے فکرِ سخن کر رہے تھے کہ انشاؔ چلے آئے، انہیں محو پایا تو پوچھا "حضرت! کس سوچ میں ہیں؟"
جرأتؔ نے کہا "کچھ نہیں بس ایک مصرعہ ہوا ہے، شعر مکمل کرنے کی سوچ رہا ہوں" انشاؔ نے عرض کیا "کچھ ہمیں بھی پتہ چلے"
جرأتؔ نے کہا "نہیں! تم گرہ لگا کر اسے مجھ سے چھین لوگے" آخر بڑے اصرار کے بعد بتایا، مصرعہ یہ تھا "اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی"
انشاؔ نے فوراً گرہ لگائی "اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی"
جرأت لاٹھی اُٹھا کر انشاؔ کی طرف لپکے، دیر تک انشاؔ آگے آگے اور جرأتؔ

پیچھے پیچھے ٹوٹلتے ہوئے بھاگتے رہے۔

ایک دن کوئی صاحب ناسخ سے ملاقات کو آئے۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا، شغل بیکاری سے تنگ آکر آہستہ آہستہ چھڑی کی نوک سے توڑنے لگے۔ ناسخ نے دیکھا تو انہیں بے حد ناگوار گزرا۔ نوکر کو آواز دی اور فرمایا "میاں ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان کے سامنے رکھ دو، دل لگا کر شوق پورا کریں"۔

وہ صاحب شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ایک بار ایک شخص نے شیشے کے تین چمچے ناسخ کی خدمت میں پیش کئے، اتنے میں ایک امیر صاحبزادے آئے، چمچوں کو اُٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے، تعریف کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، ساتھ ہی آپ چمچے سے کھیلنے لگے، شیشے کی بساط ہی کیا تھی، ٹھیس زیادہ لگی اور ٹوٹ گیا، ناسخ نے جھٹ دوسرا چمچہ اُٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "اب اس سے شغل فرمایئے"۔

ایک شخص نے امام بخش ناسخ کو بیحد تنگ کیا، تو نوکر کو بُلا کر صحن دھنچہ منگایا۔ اس میں سے مکان کی چابیاں نکال کر ان کے حوالے کیں اور نوکر سے کہا۔

"بھائی مزدوروں کو بُلا لو اور اسباب اُٹھوا کر لے چلو"

"دیکھتے کیا ہو! مکان پر تو قبضہ کر چکے، ایسا نہ ہو کہ اسباب بھی ہاتھ سے

جاناں رہے۔

ایک بار اُستاد ذوق یہ قصیدہ لکھ رہے تھے ۔ ع

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت

اتنے میں ایک چڑیا آکر ان کے سر پر بیٹھ گئی' یہ عالم محویت میں بیٹھے رہے کچھ پتہ چلا تو اسے اُڑا دیا' وہ پھر آن کر بیٹھ گئی' پھر اُڑایا' پھر آ بیٹھی' قریب ہی حافظ ویران بیٹھے تھے' حافظ صاحب نابینا تھے' پوچھا "کیا ہے؟" ذوق نے حال بیان کیا تو ویران بولے "ہمارے سر پر نہیں بیٹھتی ؟" انہوں نے جواب دیا "کیونکر بیٹھے ؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے' عالم ہے' حافظ ہے' ابھی بسم اللہ اللہ اکبر کر دیگا' دیوانی ہے ؟ جو تمہارے سر پر آئے ؟"

امیر مینائی کو جب ان کے ایک ہم عصر نے اپنا یہ شعر سُنایا ۔

بے حجاب اس کو کیا شوخی نے میری وصل میں
ایک بات ایسی کہی جامے سے باہر ہو گیا

تو امیر مینائی نے متانت سے کہا' غالباً آپنے انہیں بڑی بی کہہ دیا ہوگا۔

ایک مرتبہ علماء میں بحث چل نکلی کہ اجمیر شریف' تونسہ شریف' بغداد شریف کہنا جائز ہے یا ناجائز' بعض علماء اس کے موافق تھے اور بعض مخالف' ایک شخص نے مولوی نذیر احمد سے بھی فتوائے طلب کیا' انہوں نے جواب دیا " اگر مزاج شریف

کہنے میں کوئی مضائقہ ہے تو بے شک اجمیر شریف کہنا بھی درست نہیں۔"

دہلی میں ایجوکیشنل کانفرنس ہورہی تھی اور نذیر احمد تقریر کر رہے تھے، اتنے میں لارڈ کچز تشریف لائے، مولوی صاحب چند منٹ تقریر کر کے بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد جب لارڈ صاحب رخصت ہوئے تو مولوی صاحب پھر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اس آیت کے ساتھ تقریر شروع کی۔

قد جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

"حق آگیا ..... اور باطل چلا گیا۔ بیشک باطل کو چلا جانا ہے۔"

لارڈ کچز عربی جانتے تھے سمجھ گئے کہ بڑھے نے کیا خوب چوٹ کی ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول "بدرالنساء کی مصیبت" شائع ہوا تو خواجہ حسن نظامی نے ڈپٹی نذیر احمد سے پوچھا "حضرت پردے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" ڈپٹی صاحب نے فرمایا "کس کے پردے کے متعلق جواب دوں، زمانہ وہ آگیا ہے کہ اب تو لڑکوں کو بھی پردہ کرنا چاہیئے۔"

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پاس عربی کی ایک کتاب تھی، دلی کے ایک مولوی صاحب اس کتاب کو دیکھنے کے شائق تھے، تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ ڈپٹی صاحب نہ انکار کرتے نہ دینا چاہتے تھے، مولوی صاحب کے اصرار پر آخر انہیں ایک دن کتاب دینی پڑی۔ کتاب مولوی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈپٹی صاحب

نے فرمایا "کتاب تو بڑی اچھی ہے لیکن اس کی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔"
مولوی صاحب نے یہ الفاظ سُنتے تو لاحول پڑھتے ہوئے فوراً پیچھے ہٹ گئے
اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ جلسے میں مولوی رضی الدین بسمل
نے اپنی ایک بڑی درد انگیز قومی نظم حاضرینِ جلسہ کو سُنائی۔ سامعین پر رقت
طاری ہو گئی۔ نظم کے خاتمہ پر نواب محسن الملک نے اُٹھ کر کہا "مولوی رضی الدین
صاحب نے اپنا تخلّص تو بسمل رکھا ہے، مگر نظم ایسی سُنائی کہ دوسروں کو بسمل کر دیا۔"

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ وقت کے بڑے پابند تھے، ان کا معمول تھا کہ
روزانہ دن کے ٹھیک نَو بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب
دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے، ایک دن جو باہر نکلے تو سر سید کے لڑکے سید
محمود گھڑی لئے اپنے مکان کے آگے ان کے انتظار میں ٹہلتے نظر آئے۔ مولانا نے
پوچھا "میاں! یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟" سید محمود نے جواب دیا "جی! میں اپنی گھڑی
کو چابی دینا بھول گیا تھا، اسلئے وہ بند ہو گئی، بس اب آپ کے انتظار میں ٹہل
رہا تھا تاکہ اپنی گھڑی درست کر لوں۔"

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارنپور گئے اور وہاں کے ایک معزز رئیس زمیندار
کے پاس ٹھہرے، گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے، اسی وقت

اتفاق سے ایک کسان آگیا' رئیس صاحب نے کہا" یہ بزرگ جو آرام کر رہے ہیں اُن کو پنکھا جھل" وہ بچارہ پنکھا جھلنے لگا' تھوڑی دیر بعد اس نے آہستہ سے رئیس صاحب سے پوچھا" یہ بزرگ کون ہیں؟" رئیس صاحب نے جواب دیا' "کم بخت! تو ان بزرگ کو نہیں جانتا' حالانکہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہو رہا ہے' یہ مولوی حالی ہیں" اس پر غریب کسان نے بڑے تعجب سے کہا" جی! کبھی ہالی بھی مولوی ہوئے ہیں؟ (وہ کسان حالی کو ہالی یعنی ہل چلانے والا سمجھا) مولانا یہ سُن کر پھڑک اُٹھے' فوراً اُٹھ کر رئیس سے کہنے لگے" حضرت! اس تخلص کی داد آج ملی ہے"

ایک بار مولوی محمد یحییٰ تنہا نے مولانا حالی کو اپنی شادی میں پانی پت بلایا' شادی کے بعد مولانا حالی' مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے' اسماعیل میرٹھی مسکراتے ہوئے تنہا صاحب سے بولے" اب آپ اپنا تخلص بدل دیں کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے"

اس پر مولانا حالی نے فرمایا کہ" نہیں مولوی صاحب! یہ بات نہیں' تن ہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں" اس جودتِ طبع پر تمام مجلس حیران رہ گئی۔

مولانا حالی کے مقامی دوستوں میں مولوی وحیدالدین سلیم تھے' جب یہ پانی پت روانہ ہوتے تو روزانہ مولانا حالی کے پاس جاکر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے' ایک روز صبح ہی صبح پہنچے' مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی' وہ انکو سنائی

سلیم سُن کر پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے "مولانا! واللہ جادو ہے۔"
مولانا کے بالاخانے کے نیچے ایک کوٹھڑی تھی وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لئے دے دی تھی۔ وہ مجذوب باہر گلی میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا جب اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلّا اُٹھا "جادو برحق، کرنے والا کافر" مولانا نے مسکرا کر سلیم صاحب سے کہا۔
"لیجئے مولوی صاحب! سرٹیفکیٹ مل گیا"

ایک روز مولانا فیض الحسن سہارنپوری طلبار کو فلسفہ کا یہ درس دے رہے تھے کہ انسان کا خیال اضطراری ہے، اختیاری نہیں، ہر بات اور ہر شئے تک بغیر ارادہ کے خیال کے پہنچ جاتا ہے۔

درس کے بعد طلبا، کو لیکر مسجد سے نکلے، راہ میں ایک جگہ ناچ ہو رہا تھا۔ اور بہت سے آدمی جمع تھے، آپ علم و فضل کے باوجود نہایت رنگین مزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ طلبار کو چھوڑ کر ناچ دیکھنے میں مصروف ہوگئے، طلبار نے جو یہ دیکھا تو بڑے حیران ہو کر کہنے لگے۔

"ہیں مولانا! کہاں یہ علم و فضل اور کہاں یہ ناچ رنگ، یہ حرکت آپ کی شان کے شایاں نہیں"

مولانا نے جواب دیا۔ "ابھی تو پڑھ کر آئے ہو، انسان کا خیال اضطراری ہے اختیاری نہیں، پھر مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو، جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے ناچ سے لطف اُٹھانے دو۔"

جب کانگرس نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور گاندھی جی نے مولانا محمد علی جوہر کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصّہ لینے کی دعوت دی تو مولانا نے فرمایا۔ "میں کیا نمک بناؤں گا' قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں"

(مولانا کو ذیابیطیس کا عارضہ تھا)

شملہ کی دعوت میں جہاں سب اُونچے اور سرکاری طبقے کے افراد موجود تھے' مولانا محمد علی جوہر بھی اپنے فقیرانہ لباس میں وہاں موجود تھے گفتگو اُردو زبان میں ہو رہی تھی' کسی بات پر اُلجھ کر مولانا نے انگریزی میں بولنا شروع کر دیا' اب کون ان کے سامنے ٹکتا' وہاں ایک ہندو رانی بھی موجود تھیں' اِن سے نہ رہا گیا' ایک مولوی صاحب کو یوں فرفر انگریزی بولتے دیکھ کر پوچھ بیٹھیں۔

"مولانا! آپ نے یہ اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی ہے؟"

مولانا نے جواب دیا "میں نے یہ انگریزی ایک معمولی سے قصبے میں سیکھی ہے"۔

رانی نے حیرت زدہ لہجہ میں پوچھا "کیا نام ہے اس قصبے کا؟"

مولانا نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ "آکسفورڈ"

مولانا کے اس جواب پر ساری محفل زعفران زار بن گئی۔

جب مولوی عبدالحق اورنگ آباد سے انجمن ترقی اُردو کا دفتر دہلی لے آئے تو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ان سے دریا گنج میں ملے اور کہا "اگر پانی پت میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی جلسہ کیا جائے تو کیا آپ تشریف لے آئیں گے؟

مولوی صاحب فرمانے لگے۔

" اگر جہنم میں بھی اُردو کی حمایت اور نصرت میں کوئی جلسہ منعقد ہو تو میں وہاں بھی خوشی سے جانے کو موجود ہوں "

مولانا ابوالکلام آزاد جنہیں جیل اللہ آباد میں قید تھے اس زمانے کا ایک مزیدار لطیفہ انہی کی زبانی سنئے۔

" جیل میں میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا مگر زبان کی بیگانگی کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے، ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے' ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں' غالباً سوچتا رہتا ہوگا' آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا' میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ لہرانے لگا' یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا' خاموش رہا' تو اس نے پوچھا۔

" اوپیم ؟" " یعنی کیا افیم کے معاملے میں پکڑے گئے ہو ؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرا' یعنی کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا' تو آخر اس نے پوچھا۔ " گاندھی "

اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا' گویا اس کے نزدیک گاندھی بھی ناجائز افیون اور قتل کی طرح جرائم میں داخل ہے۔

ایک روز کسی صحبت و شعر و سخن میں مولانا صہبائی کا ذکر آیا، میرزا نے کہا کہ مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے۔ عمر بھر میں ایک چلو بھی نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے، سُبحان اللہ، قربان جایئے اس اتقا کے اور صدقے جایئے اس تخلص کے۔

میرزا نے حضرت صاحب عالم مارہروی سے ان کا سنِ ولادت دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ میرا سالِ ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے جس کا عدد ۱۲۱۱ھ ہے۔ میرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں واقع ہوئی تھی، چنانچہ اس کے جواب میں میرزا نے یہ شعر لکھ بھیجا ؎

ہاتفِ غیب سُن کر یہ چیخا
ان کی تاریخ میرا تاریخا

سردیوں کے دن تھے، ایک نواب صاحب میرزا کے ہاں تشریف لائے، میرزا نے ایک گلاس شراب سے بھر کر اُن کے آگے رکھ دیا۔

نواب صاحب بولے " میں توبہ کر چکا ہوں۔
میرزا صاحب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا،
" کیا جاڑے میں بھی ؟"

میرزا کے ایک شاگرد نے اُن سے کہا۔

"حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا مزار پر کھرنی کا درخت ہے، اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں، کھرنیوں کا کھانا تھا کہ فصاحت و بلاعت کا دروازہ کھل گیا، دیکھئے میں کیسا فصیح و بلیغ ہو گیا ہوں۔

میرزا صاحب چہک کر بولے۔

"ارے میاں تین کوس کیوں گئے؟ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں، جو چودہ طبق روشن ہو جاتے"

ایک بار اپنے شاگردوں سے کہنے لگے۔

"جب میں مرجاؤں تو کہیں سے پرانا کفن لانا اور اس میں مجھ کو لپیٹ کر رکھ دینا"

شاگردوں نے پوچھا" اس سے کیا فائدہ؟"

میرزا نے جواب دیا" "جب منکر نکیرین آئیں گے تو پرانا کفن دیکھ کر سوال وجواب کے بغیر ہی پلٹ جائیں۔

میرزا غالب

مرزا غالبؔ طبعاً زندہ دل اور خوش مزاج تھے' ان کی یہ خوش مزاجی ان کے خطوں میں بھی جھلکتی تھی، تنگدستی کے دنوں میں جب پنشن وغیرہ بند تھی اور پینے پلانے کا سامان مہیا نہیں تھا۔ اپنے ایک خط میں اپنی حالت کو یُوں بیان کرتے ہیں۔

" میر مہدی! صبح کا وقت ہے' جاڑا خوب پڑ رہا ہے' انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں' ہاتھ تاپتا جاتا ہوں' آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ تر کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی' دل توانا ہو گیا' دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا' ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!"

ایک خط میں برسات کی شدّت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں۔

" دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے' میں مرنے سے نہیں ڈرتا' فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں' چھت چھلنی ہو گئی ہے' ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخوں میں خط لکھا۔ انہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی تاریخ کو دیا۔ اس کے جواب میں غالبؔ انہیں لکھتے ہیں ـــــ " دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں' ۱۸۵۸ء کے

خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے تو دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔

اپنے روزوں کے بارے میں ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا، یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا، یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور چیز ہے۔"

مرزا صاحب کی پنشن بند ہوتی تو لوگوں نے احوال پرسی کے خطوں کا تانتا باندھ دیا، ایک بار میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تو جواب میں مرزا نے لکھا۔

"میاں! بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رازق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔"

ایک روز دیوان فضل اللہ خاں بگھی میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے انہیں ملے بغیر گذر گئے، مرزا کو پتہ چلا تو انہوں نے اس مضمون کا رقعہ دیوان جی کو لکھ بھیجا۔ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوتی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی تو اس طرف سے

گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں "
جب رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوا' اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہوکر مرزا صاحب کو ملنے چلے آئے۔

نواب علاؤ الدین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ع
بدستِ مرگ ولے بدتر از گماں تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کونسی رباعیاں مانگتے ہو' پھر لکھتے ہو' رباعیاں بھیج! قصیدہ بھیج! معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے' اب کے تو مکرر بھیجے گا۔
بھائی قرآن کی قسم' انجیل کی قسم' توریت کی قسم' زبور کی قسم' ہنود کے چار وید کی قسم' دساتیر کی قسم' ژند کی قسم' اوستا کی قسم' گروگرنتھ کی قسم' نہ میرے پاس وہ قصیدہ' نہ مجھے وہ رباعیاں یاد' کلیات کے باب میں جو عرض کرچکا ہوں۔ ع
بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

مرزا صاحب خانہ داری کو سخت مصیبت قرار دیتے تھے' کسی نے انکے ایک شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی مرنے کا حال لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں' اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔
" امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے اللہ اللہ

ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندہ ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لُوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پھیلی، میر مہدی مجروح نے پوچھ بھیجا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا نہ مار سکے تو تف بریں وبا۔"

ایک بار مرزا نے بادشاہ کو ایک غزل سنائی جس کا مقطع ہے ؎

یہ مسائلِ تصوف! یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بادشاہ نے یہ مقطع سُن کر کہا "بھئی ہم تو جب بھی ویسا نہ سمجھتے۔"
مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔"

ایک روز مرزا برآمدے میں بیٹھے شراب پی رہے تھے، بارش ہو رہی تھی کسی نے کہا "بارش بہت ہوئی ہے" مرزا نے جواب دیا۔
"میں تو جب جانوں کہ پانی چبوترے کے اوپر آجائے" ساقی نے عرض کی۔
"حضرت! اتنے میں تو تمام دلّی ڈوب جائے گی۔"

دلی میں بعض رتھ کو مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا' تو انہوں نے کہا" بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو' اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھو۔"

ایک بار مرزا گرفتار ہو گئے' جب کرنل براون کے روبرو پہنچے تو اس نے مرزا کی وضع قطع دیکھ کر پوچھا۔ "ویل! تم مسلمان ہے ؟"

مرزا نے کہا۔" آدھا"۔ کرنل نے پوچھا۔"کیا مطلب ؟"

مرزا نے کہا۔" شراب پیتا ہوں' سؤر نہیں کھاتا۔"

مرزا جب قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب کے مکان میں آکر رہے' ایک روز کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔

مرزا نے کہا۔"کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے ؟ پہلے گورے کی قید میں تھا' اب کالے کی قید میں ہوں۔"

غدر کے بعد مرزا کی معاشی حالت دو برس تک دگرگوں رہی' آخر نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا' نواب کلب علی خاں نے بھی اس وظیفے کو جاری رکھا۔ نواب یوسف علی خاں کی وفات کے چند روز بعد نواب کلب علی خاں لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی کو روانہ ہوئے تو چلتے وقت مرزا سے کہنے لگے' "خدا کے سپرد۔"

مرزا صاحب نے کہا "حضرت! خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"

مرزا کی بیٹھک ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ تھا جس کا دروازہ بھی بہت چھوٹا تھا، یُوں وہ ایک قیدخانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا، ایک بار رمضان کے مہینے میں مفتی صدرالدین آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے آئے، اسی وقت مرزا اپنے کسی دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے، آزردہ انہیں دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا، رمضان کے مہینے میں شیطان قید ہوتا ہے، مگر آج حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا" مرزا نے کہا " قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم ہو کہ وہ جگہ جہاں شیطان قید رہتا ہے، یہی تو ہے۔"

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا، برتن تو بہت تھے لیکن کھانا نہایت قلیل تھا، مرزا نے مُسکرا کر کہا " اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔"

رمضان کا مہینہ تھا، ایک سُنی مولوی مرزا سے ملنے آئے، عصر کا وقت تھا، مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا، مولوی صاحب نے تعجب سے کہا کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا " سُنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے تو روزہ کھول دیتا ہوں۔"

مرزا نے ایک کتاب" قاطع برہان" لکھی، اس کا جواب اکثر مصنفوں نے دیا، ان میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے اور ان میں بھی زیادہ تر شوخی اور ظرافت سے کام لیا۔ لیکن مولوی امین الدین کی کتاب" قاطع قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے لکھے تھے، کسی نے کہا" حضرت آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں لکھا؟"

مرزا نے جواب دیا" اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"

ایک روز مرزا غالب اور مولانا حالی دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ ڈاکیا ایک لفافہ دے گیا، لفافہ کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آتے رہے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں کہ مرزا نے یہ خط مجھے دیا اور کہا کہ اسے کھول کر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش دشنام سے بھرا ہوا تھا، پوچھا کس کا خط آیا ہے اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اسکے اظہار میں تامل تھا، مرزا نے فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین لیا اور فرمایا" شاید آپ کے کسی شاگرد کا لکھا ہوا ہے؟"

پھر اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد کہا" اس اُلّو کو گالی بھی نہیں دینا آتی، بڈھے آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو غیرت آئے جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں سے برابر کسی سے زیادہ مانوس نہیں ہوتا، یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو

ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا۔"

ایک روز بہادر شاہ ظفر اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے، مرزا بھی ساتھ تھے، اس باغ کے آم سوائے بادشاہ یا بیگمات کے اور کسی کو میسر نہ آسکتا تھا مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے، بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" عرض کی۔ "پیر و مرشد! یہ جو کسی نے کہا ہے ؎

بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں
کیں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی دانے پر میرے نام کی مُہر بھی ہے؟"
بادشاہ مسکرائے اور اُسی روز آموں کا ایک ٹوکرا مرزا کے ہاں بھجوا دیا۔

مرزا صاحب کے دوستوں میں سے حکیم رضی الدین خاں کو آم نہیں بھاتے تھے، ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اتنے میں ایک کمہار اپنے گدھے لے کر گزرا گلی میں آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے، گدھے نے انہیں سونگھا اور چھوڑ دیا، اس پر حکیم صاحب چہک کر بولے۔

"دیکھئے! آم ایسی شئے ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا" مرزا صاحب نے جواب دیا "بے شک گدھا آم نہیں کھاتا۔"

مرزا آموں سے کبھی سیر طبیعت نہ ہوتے تھے، اہلِ شہر تحفۃً بھیجتے مرزا خود بازار

سے منگواتے ہیں، باہر سے دُور دُور کا آم بطور سوغات آتا تھا، مگر مرزا کا جی نہ بھرتا۔ ایک محفل میں مولانا فضلِ حق اور دیگر احباب بیٹھے آموں کی تعریف کر رہے تھے، جب سب لوگ اپنی اپنی رائے ہانک چکے تو مولانا فضلِ حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو، مرزا نے کہا "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو" اس پر سب حاضرین کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، تاروں کی ظاہری بے ربطی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے، ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوتے ہیں، نہ تناسب ہے، نہ انتظام نہ بیل ہے نہ بوٹا، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

ایک روز میر مہدی مجروحؔ مرزا کے پاس آئے، مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے لگے، مرزا نے کہا "بھئی تو سیّد زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے" انہوں نے نہ مانا اور کہا، "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پَیر دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں" جب وہ پَیر داب چکے تو انہوں نے اُجرت طلب کی، مرزا نے کہا "بھیّا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔"

ایک رات سیّد سردار مرزا کے ہاں تشریف لائے، جب تھوڑی دیر کے بعد

رخصت ہونے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ وہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انہوں نے کہا "قبلہ و کعبہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، میں اپنا جوتا پہن لیتا۔" اس پر مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

غدر کے بعد مرزا کی پنشن بند تھی اور دربار میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔ ایک روز پنڈت موتی لال میر منشی لیفٹیننٹ پنجاب مرزا سے ملنے آئے، پنشن کا ذکر چلا تو مرزا نے کہا "تمام عمر میں اگر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور اگر ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کر لیا۔"

ایک شام مرزا کو شراب نہ ملی تو نماز پڑھنے چلے گئے۔ اتنے میں ان کا ایک شاگرد آیا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ مرزا کو آج شراب نہیں ملی، چنانچہ وہ مسجد کے سامنے پہنچا اور وہاں سے بوتل دکھائی، مرزا وضو کرنے کے بعد مسجد سے نکلنے لگے تو کسی نے کہا "یہ کیا؟ کہ بغیر نماز پڑھے چل دیئے؟" انہوں نے کہا۔
"جس چیز کے لئے دعا مانگنا تھی وہ تو یونہی مل گئی۔"

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا، طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا، مرزا نے دیکھا تو کہا۔

میاں مِٹھو! نہ تمہارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو۔"

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان خود دیکھ کر آئے۔ اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا۔ مگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے، گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انہوں نے کہا "اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں" مرزا نے چہک کر جواب دیا "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"

مرزا کی زندگی یا تو واقعی مصائب سے پُر تھی یا پھر وہ حساس دل کے ہاتھوں تنگ تھے، چنانچہ آخری عمر میں موت کی آرزو بڑھ گئی تھی۔ ہر سال اپنی تاریخ وفات نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔

۱۸۶۶ء میں انہوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی "غالب مُرد" اس سے پہلے کے مادے غلط ہو چکے تھے، منشی جواہر سنگھ جوہر سے مرزا نے اس مادے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا "حضرت! انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا" مرزا نے کہا "دیکھو صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک بار مرزا غالب اور ان کا ایک مہمان کسی دعوت سے رات کے وقت واپس آرہے تھے۔ ایک تنگ گلی میں ایک گدھا کھڑا تھا۔ مہمان رُک کر بولا۔

"مرزا صاحب! دلّی میں گدھے بہت ہیں۔" مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"صاحب! باہر سے آجاتے ہیں۔"

مرزا صاحب کا نماز سے کس قدر تعلق تھا؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو جاتا ہے کہ ایک مرتبہ گھر جانے لگے تو دیکھا بیگم صاحبہ عین صحن میں مصلا بچھائے نماز پڑھ رہی ہیں۔ مرزا صاحب نے یہ دیکھا تو دروانے پر ٹھہر گئے جب وہ نماز پڑھ چکیں تو آپ نے جوتا اتار کر سر پر رکھا، اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ ڈرتے ہچکچاتے ہوئے صحن تک آئے۔ بیگم نے یہ حالت دیکھی تو مسکرا کر کہنے لگیں "یہ کیا؟"

آپ نے جواب دیا "کچھ نہیں صرف آپ کے مصلے کی تعظیم و تکریم ہے۔"

بیگم نے ذرا تشریح چاہی تو کہا۔ "اب تو سارا صحن مسجد ہوگیا پھر اگر کوئی قدم رکھے؟ اور کرے تو کیا کرے؟ اسلئے جوتا اتار کر سر پر رکھ لیا ہے۔"

ایک روز کسی سے کہنے لگے "کیوں صاحب! ہم تو مرد ہیں ہمارا نماز پڑھنا ٹھیک ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس لئے کہ حوریں ملیں غلمان ملیں۔ یہ عورتیں آخر کیوں نماز پڑھتی ہیں؟ انہیں کس کی تلاش ہے؟"

مرزا کی بہن بیمار ہوئیں تو عیادت کو گئے پوچھا "کیا حال ہے؟"

بولی "مرتی ہوں" قرض کی فکر ہے کہ گردن پہ لئے جاتی ہوں" آپ نے کہا۔

"اوہو! بھلا یہ کیا فکر ہے؟ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا لیں گے؟"

ایک دن مرزا غالب فخر الملک بہادر کو ملنے گئے۔ جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمتگار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں وہ کسی کام میں مصروف تھے۔ "بلا نہ سکے" مرزا غالب وہیں ٹہلتے رہے صاحب عالم نے کچھ دیر کے بعد ملازم کو پکار کر فرمایا "دیکھ! مرزا صاحب کہاں ہیں؟" مرزا صاحب نے وہیں سے جواب دیا "غلام گردش میں ہے۔"

اور مرزا کی اس شوخی کا علم تو سب کو ہے کہ ایک بار کسی بنئے کا بہت سا قرض میرزا کے سر چڑھ گیا۔ اُسے جب روپیہ ملنے کی امید نہ رہی تو مجبوراً ڈگری کروادی۔ بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا۔ مرزا خود تو نہ گئے البتہ حکمنامے کی پشت پر لکھ دیا ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں!
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بادشاہ نے یہ پڑھا تو مسکرائے اور ڈگری کا روپیہ خزانے سے جاری کر دیا۔

اکبر الہ آبادی

سر سید احمد خاں کو ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا۔ تو اکبر الہ آبادی نے ان پر پھبتی کسی۔ ؎

فضلِ خدا سے یہ عزت پائی　　آج ہوئے ہم سی ایس آئی
شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی　　بولے ہوئے ہیں ہم عیسائی

ایک جوتا فروش اکبر الہ آبادی کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے جوتوں کی دوکان کھولی ہے، اس لئے کوئی شعر ہو جائے تو اکبر نے کہا ؎

شو میکری کی کھولی ہے ہم نے دوکان آج
روٹی کو ہم کمائیں گے جوتوں کے زور سے

گوہر نامی طوائف نے اکبر الہ آبادی سے درخواست کی کہ کوئی شعر میرے لئے بھی ہو جائے، اکبر نے فی البدیہہ کہا ؎

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

ایبٹ آباد کے ایک وکیل مولوی الف دین نے اپنی تصنیف کردہ ایک کتاب اکبر الہ آبادی کے پاس بھیجی، الف دین نام کے عجب پن نے اکبر الہ آبادی

کی طبیعت میں گدگدی پیدا کر دی ' چنانچہ وہ کہنے لگے ۔

" پنجاب میں نام بھی عجیب عجیب رکھے جاتے ہیں ' چراغ دین ' گل محمد ' گلزار محمد ' اور ..... سڑک از کوئے محمد "

تھوڑی دیر تک سنتے رہے ' پھر وکیل صاحب کو لکھ بھیجا ۔ ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کر بے دین نے پائی راہِ صواب

ایک مرتبہ حضرت اکبر الہ آبادی کے دوست نے انہیں ایک ٹوپی دکھائی جس پر قل ہواللہ کڑھا ہوا تھا آپ نے دیکھتے ہی فرمایا ۔

" بھئی بہت عمدہ ہے کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو جائے تو یہ ٹوپی پہن لیا کرو ' سب سمجھ لیں گے کہ انتڑیاں قل ہواللہ پڑھ رہی ہیں "

اکبر الہ آبادی کے کوئی عزیز بائیسکل سے گر پڑے ' اور ہفتہ بھر صاحب فراش رہے ' جب تندرست ہو کر انکی خدمت میں گئے تو حضرت فرمانے لگے ۔

" بُرا مو جی ! مجھے کوئی قدامت پسند کہے یا قدامت پرست ! مجھے تو عہدِ حاضر کی اچھی سے اچھی ایجاد میں بھی نقصان و ضرر کے پہلو نظر آتے ہیں ' خواہ موٹر ہو یا ہوائی جہاز ...... اور بائیسکل تو مجسم روگ ہے ' دیکھ لو ' مرض " بائی " سے شروع ہوتا ہے ' پھر " سِک " ہوتا ہے ' پھر " اِل " بنتا ہے ' یوں بائیسکل بنتا ہے ۔

۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں والئی کابل ہندوستان آئے تو اکبرالہ آبادی نے لکھا ؎

دنا رآتے ہیں جو کابل کے تو بڑتے سب کے حصے ہیں
امیر آئے تو ہم کو کیا مزے ہیں لارڈ منٹو کے

اسی طرح جب ترکِ موالات کی تحریک میں مسلمان بھی شامل ہو گئے تو آپ نے لکھا ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر کے مشہور ہو جانے پر بہت سے لوگوں نے ان کی شاگردی کا دعویٰ کر دیا۔ ایک صاحب کو دُور کی سوجھی اور انہوں نے خود کو اکبر کا استاد مشہور کر دیا۔ اکبر کو جب یہ اطلاع پہنچی کہ حیدرآباد میں ان کے ایک اُستاد کا ظہور ہوا ہے تو کہنے لگے۔ "ہاں مولوی صاحب کا ارشاد سچ ہے' مجھے یاد پڑتا ہے' میرے بچپن میں ایک مولوی صاحب الہ آباد میں تھے۔ وہ مجھے علم سکھاتے تھے اور میں اُن کو عقل' مگر دونو ناکام رہے' نہ مولوی صاحب کو عقل آئی اور نہ مجھ کو علم۔"

ایک دفعہ اکبر سخت بیمار تھے' جگر کی خرابی کی وجہ سے حکیموں نے تجویز کیا کہ اُونٹنی کا دودھ پیجئے' مسکرا کر کہنے لگے۔

"بڑھاپے میں جگر کی خرابی مجھے شیر خوار بنا رہی ہے' ماں باپ نے بچپن میں ہی

غلطی کی، اگر کسی "دراز قامت" اَنّا کا دودھ پلا دیتے تو آج یہ اُوڈنٹنی کا دودھ کیوں تلاش کرنا پڑتا ۔"

ایک روز اکبرالہ آبادی خواجہ حسن نظامی کے ہاں مہمان تھے، دو طوائفیں خواجہ صاحب سے تعویذ لینے آئیں حضرت اکبر گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے تھے دفعتاً ان کے دونوں ہاتھ اُوپر کو اُٹھے اور اس طرح پھیل گئے، جیسے بچے کو گود میں لینے کے لئے پھیلتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکلا " آیئے آیئے ! سے

فقیروں کے گھر میں لُطف کی راتیں بھی آتی ہیں

زیارت کے لئے اکثر مسماتیں بھی آتی ہیں

میں تو خیال کرتا تھا یہاں صرف مریدنے نازل ہوتے ہیں لیکن آج تو حُوریں بھی اُتر آئیں ۔"

حکیم اجمل خاں وغیرہ نے اکبرالہ آبادی کی دعوت او کھلا نہر کے کنارے کی۔ یہ نہر جمنا سے کاٹی گئی ہے" اکبر دریا کے بند کو دیکھ کر بولے " انگریز بھی کیا شے ہیں جمنا کی آزادی چھین لی، مجھے معلوم نہ تھا کہ الہ آباد کی زمین میں پہنچنے سے پہلے جمنا مائی کا پانی کاٹ لیا جاتا ہے ۔"

ایک صاحب بولے " جمنا بھی کیا پیران کلیر کے پاس انگریزوں نے گنگا بھی کاٹ لی ہے، اور اس کے بنانے والے کا نام کاٹلی ہے ۔" حضرتِ اکبر نے فرمایا ع

" کاٹلی صاحب نے گنگا کاٹ لی "

ایک بار مولانا عبدالماجد دریاآبادی بار بار مثنوی مولانا روم کا ذکر کر رہے تھے، آخر حضرت اکبر سے نہ رہا گیا، بول اُٹھے۔

کیوں صاحب! یہ فرمایئے کہ اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟"

مولانا نے جواب دیا ——— "اللہ میاں"

بولے میں آپ کی گفتگو سے یہ سمجھا تھا کہ شاید مولانا رومؒ بڑے ہیں، جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انہیں کا ذکر کر رہے ہیں، اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہیں سُنا"

ایک کافی عمر رسیدہ مگر فیشن ایبل بزرگ بناؤ سنگار میں مصروف تھے، وہ اکبر کے بے تکلف دوستوں میں تھے مگر اکبر کو دیکھ کر جھینپ گئے۔
اکبر ایسے موقعوں پر کب چوکنے والے تھے مسکرا کر کہنے لگے ؎

مصروف ہیں حضور کس بندوبست میں
اپریل کی بہار نہ ہوگی اگست میں

سرسید احمد خاں

ایک دفعہ سرسید ریل میں سوار تھے، کسی اسٹیشن پر دو انگریز ان کی گاڑی میں آ بیٹھے، ان میں سے ایک پادری تھا، انہیں معلوم ہو گیا کہ سرسید احمد خاں یہی ہیں، چنانچہ پادری نے سرسید سے کہا۔

" مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا، میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں "۔

سرسید نے کہا " میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں ؟

اس نے کہا " خدا کی "۔

سرسید نے کمال سنجیدگی کے ساتھ کہا " میری تو ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اس لئے میں ان کو نہیں جانتا "۔

پادری نے متعجب ہو کر کہا " ہیں ! آپ خدا کو نہیں جانتے ؟ "

انہوں نے جواب دیا " مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اس کو کوئی بھی نہیں جانتا " پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا " آپ اسے جانتے ہیں ؟ "

پادری نے کہا " نہیں !! میں اس سے کبھی نہیں ملا "

سرسید نے کہا " پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مجھ کو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، میں اس کو کیونکر جان سکتا ہوں ؟ "

پادری یہ سُن کر خاموش ہوگیا اور اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہنے لگا۔
" یہ تو سخت کافر ہے "

ایک بار کسی مضمون میں سرسید احمد خاں نے لکھا کہ اجماع جیسا کہ اہلِ سنّت سمجھتے ہیں، حجت شرعی نہیں ہے" ایک شیعہ نے یہ مضمون پڑھا تو بہت خوش ہو کر سرسید سے ملنے آیا اور ان سے کہنے لگا۔

" کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفۂ اوّل کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟"

سرسید نے جواب دیا" حضرت! نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا؟"

وہ یہ سُن کر اور بھی خوش ہوا اور کہنے لگا" کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کچھ لوگ خلیفۂ اوّل کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟"

سرسید نے اُسی متانت کے ساتھ جواب دیا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کسی کیلئے کوشش کرتا؟ مجھ سے جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور شاید کامیاب ہوتا" یہ سُن کر اُن حضرت نے جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔

ایک بار سرسید لندن میں تھے تو ڈیوک آف آرگائل نے دعوت میں شراب بھی پیش کی، آپ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں نوح کی شراب نہیں پیتا صرف آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہوں۔

ایک صحبت میں سرسید، مولانا شبلی اور مولوی ممتاز علی تینوں موجود تھے اور خوب باتیں ہو رہی تھیں، اتفاقاً سرسید کا کوئی اہم کاغذ کھو گیا بہت ڈھونڈا نہ ملا۔ سرسید بہت پریشان ہوئے، کسی طرح مولانا شبلی نے اس کاغذ کو پالیا اور سرسید کو ذرا ڈرانے اور تماشا دیکھنے کی غرض سے اپنا ہاتھ کاغذ پر رکھ دیا۔ اُدھر سرسید بھی اس ادائے خاص کو بھانپ گئے کہ مطلوبہ کاغذ کو مولانا شبلی ہاتھ کے نیچے دبائے بیٹھے ہیں، آپ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا،

" بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے اس کو شیطان اپنے ہاتھ تلے دبا کر بیٹھ جاتا ہے "

پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر مولانا سے فرمایا " ذرا دیکھنا تو میرا وہ کاغذ کہیں تمہارے ہاتھوں تلے تو نہیں " اس پر مولانا نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور وہ کاغذ نظر آیا۔ تو سب کی باچھیں کھل گئیں اور محفل قہقہہ زار ہو گئی۔

محمڈن کانفرنس کا جلسہ ہو رہا تھا، سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک شبلی، حالی، نذیر احمد سبھی موجود تھے، اتنے میں پنجاب کے ایک مشہور زمیندار جو خطاب یافتہ بھی تھے، تقریر کرنے کھڑے ہو گئے اور بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ سرسید ہماری قومی کشتی کے ناکتخدا ہیں، ساری محفل دیوار قہقہہ بن گئی، سرسید بڑے متین بزرگ تھے لیکن اپنی ناکتخدائی کا ذکر سن کر انہیں بھی بے اختیار ہنسی آ گئی۔

مولوی علی بخش خاں مرحوم سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ لینے کو معظمہ گئے تو سرسید نے

لکھا۔ "سبحان اللہ ہمارا کفر بھی گیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی (ہجو کرنے والا) اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے سرسید سے پوچھا کہ اگر نماز میں بجائے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لیا جائے تو کوئی ہرج یا نقصان تو نہیں؟

سرسید نے جواب دیا۔ "ہرگز کوئی ہرج اور نقصان نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی۔"

دلّی میں ایک طوائف تھی جس کا نام "شیریں تھا" مگر اس کی ماں بہت بھدی اور بُری شکل کی تھی۔ ایک مجلس میں شیریں اپنی ماں کے ساتھ مجرے کیلئے آئی، سرسید وہاں موجود تھے انکے برابر ان کے ایک ایرانی دوست براجمان تھے، وہ شیریں کی ماں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"مادرش بسیار تلخ است" اس پر سرسید نے فوراً جواب دیا۔

"گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔"

ایک مولوی صاحب نے سرسید کو خط لکھا کہ میں معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں، عربی جانتا ہوں، انگریزی سے ناواقف ہوں کسی ریاست میں میری سفارش کردیں۔"

سرسید نے جواب دیا کہ سفارش کی میری عادت نہیں۔ معاش کی تنگی کا آسان حل یہ ہے کہ میری تفسیر القرآن کا رد لکھ کر آپ چھپوائیں، کتاب خوب بکے گی، اور آپ کی تنگی دور ہو جائے گی۔

علامہ اقبال

علامہ اقبال بچپن ہی سے بذلہ سنج اور شوخ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ایک روز جب ان کی عمر گیارہ سال تھی، انہیں سکول پہنچنے میں دیر ہوگئی، ماسٹر صاحب نے پوچھا "اقبال تم دیر سے آئے ہو۔"

آپ نے بے ساختہ جواب دیا "جی ہاں! اقبال ہمیشہ دیر ہی سے آتا ہے۔"

ایک دفعہ علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا، اہل ذوق دُور دُور سے مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے، علامہ اقبال بھی موجود تھے، مشاعرے کے اختتام پر علی گڑھ کے چند مقامی شعراء نے علامہ کو پریشان کرنے کی ٹھانی، انہوں نے ایک مصرعہ منتخب کرکے علامہ کو اس پر گرہ لگانے کے لئے کہا۔ ع

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

علامہ اقبال ایسے بکھیڑوں سے پرہیز کرتے تھے، تاہم لوگوں کے بجد اصرار پر برمصرعہ لگا کر شعر مکمل کر دیا ؎

اشک سے دشت بھریں آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

پنجاب کے مشہور قانون دان چوہدری شہاب الدین علامہ کے بے تکلف

دوستوں میں سے تھے' ان کا رنگ کالا اور ڈیل ڈول بہت زیادہ تھا' ایک روز وہ سیاہ سوٹ پہنے ہوئے اور سیاہ ٹائی لگائے کورٹ میں آئے تو اقبال نے سرتا پا سیاہ دیکھ کر کہا۔

" ارے چودھری صاحب! آج ننگے ہی چلے آئے "

ایک روز یہی چودھری صاحب سرتاپا سفید کپڑے پہن کر ایک دعوت میں آئے تو اقبال نے انہیں دیکھ کر پھر چوٹ کی۔

" دیکھو! کپاس میں بھینسا گھس گیا "

۱۹۳۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے برطانوی حکومت پر ان الفاظ میں چوٹ کی۔

" جنگ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند ملاقاتی اس کے پاس گئے، تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا سگار پی رہا ہے' اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

" آج کل مجھے بالکل فرصت ہے' کیونکہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کو سونپ رکھا ہے۔

کابل کے نادر خاں ایک بار لاہور ٹھہرے ہوئے تھے' علامہ کی صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے' کہنے لگے " آپ اقبال ہیں ؟ میں تو سمجھا تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے "

علامہ نے جواب دیا "آپ سے زیادہ حیرانی مجھے ہے، کہ آپ تو جرنیل ہیں، میں سمجھتا تھا آپ دیوہیکل ہوں گے، مگر آپ میں جرنیل کی کوئی شان نہیں، اس قدر دبلے پتلے؟"

چوہدری شہاب الدین بلدیۂ لاہور کے صدر منتخب ہو گئے، اسی زمانے میں سر شجاع الملک مہتر چترال لاہور تشریف لائے، نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ہاں پر تکلف دعوت دی گئی، اور نواب صاحب نے علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ہز ہائی نس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجئے، علامہ اقبال تعارف کرانے لگے جب چوہدری صاحب کی باری آئی تو کہا " اعلیٰ حضرت! ایں خاں بہادر چوہدری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور ہستند، گویا کہ مہتر لاہور می باشند "

مجلس میں ایک قہقہہ بلند ہوا، اور چوہدری صاحب جل کر راکھ ہو گئے۔

لارڈ کچز جس جہاز میں سفر کر رہے تھے، وہ غرق ہو گیا تھا اور اُن کی نعش بھی نہ ملی تھی، اسی زمانے میں افواہ اڑی کہ لارڈ کچز بچ گئے ہیں، ایک دوست نے علامہ سے کہا کہ " سُنا گیا ہے لارڈ کچز زندہ ہو گیا ہے؟"

آپ نے فرمایا " ہاں، کا ڈبلیو آ ٹی کی صورت میں واپس آ گیا ہو تو تعجب نہیں ہے"

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان علامہ کے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے، ان دنوں علامہ انار کلی بازار میں رہتے تھے، اور وہیں طوائفیں آباد تھیں، میونسپل کمیٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی چنانچہ انہیں وہاں سے اُٹھا دیا گیا، اس زمانے میں

مولوی انشاء اللہ کئی مرتبہ علامہ سے ملنے گئے۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن گھر پر مل گئے۔ مولوی صاحب نے مزاحاً کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! جب سے طبیہ کالج انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔"

علامہ نے جواب دیا "مولوی صاحب! کیا کیا جائے وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہیں۔" مولوی صاحب کٹ گئے۔

میاں بشیر احمد صاحب کو دیکھ کر علامہ اقبالؔ اکثر کہا کرتے تھے "آئیے مولانا بشیر" ایک بار انہوں نے مسکرا کر ذرا احتجاج کیا "ڈاکٹر صاحب! میں کہاں کا مولانا ہوں"؟ مسکرا کر کہنے لگے "واہ مولانا! کوئی بڑی بات ہے اور کیا مولانا ؤں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ آخر کچھ تو عربی جانتے ہی ہو نا؟"

بچپن میں اقبالؔ کو بٹیریں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز سبق پڑھ رہے تھے اور ایک بٹیر ہاتھ میں تھی۔ ان کے استاد مولانا میر حسن نے دیکھا تو فرمایا کم بخت! تجھے ان بٹیروں کو ہر وقت ہاتھ میں تھامے رکھنے میں کیا مزا ملتا ہے؟"

علامہ اقبالؔ نے برجستہ جواب دیا

"حضرت! ذرا اسے ہاتھ میں لے کے دیکھئے!"

ایک مرتبہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے ان کی کوئی نظم چھاپنے سے انکار

کر دیا۔ اس پر ان کی ہجو میں آپ نے کہا ہے

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت

نامِ محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

ایک صاحب نے دعوائے کیا کہ "خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے" علامہ اقبال نے ہنس کر کہا " ذرا سنبھل کر رہنا' اپنے خدا کی ساری باتیں مان نہ لیا کرو' بعض باتیں وہ یوں ہی بھی کہہ دیتا ہے " اس نے علامہ کو یہ خوش خبری سنائی کہ میں ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو اپنا پایہ تخت بناؤں گا "

اس پر علامہ نے کہا " ہم تو اس وقت کہاں ہوں گے' مگر آپ مہربانی کرکے میرے لڑکے جاوید کو نہ بھولنا ' اُسے مہرولی کا علاقہ ضرور بخش دینا "

مرض الموت میں وہی شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا

" آپ نے مجھے پہچانا نہ ہوگا " علامہ اقبال تکلیف کے باوجود ہنسے اور کہنے لگے " واہ! یہ آپ نے کیا بات کہی' ہم اور آپ کو نہ پہچانیں ولی را ولی می شناسد "

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بے حد شوق تھا' ایک روز وہ لوگ کتوں کے ہمراہ علامہ سے ملنے چلے آئے' یہ لوگ تو اُتر کر اندر جا بیٹھے اور کتے موٹر ہی میں رہے' اتنے میں علامہ کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ سے کہنے لگی۔ " ابّا ابّا موٹر میں کتے آئے ہیں " علامہ نے احباب کی طرف دیکھا اور کہا۔

" نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں "

پنجاب کے ایک پیر صاحب علامہ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

" ان دنوں سرکار لوگوں میں مفت زمین تقسیم کر رہی ہے، میں چاہتا ہوں کہ کچھ زمین مجھے بھی مل جائے ؟" علامہ نے جواب دیا۔

" درخواست لکھنے میں تو مجھے کچھ عار نہیں، لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ یہ درخواست کس کے سامنے پیش کرنی ہوگی ؟"

پیر صاحب غالباً اس بات کا مطلب سمجھ نہ پائے، انہیں خاموش دیکھ کر علامہ گویا ہوئے " ایک مشہور کتاب ہے، جس کا نام قرآن مجید ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے، اسلئے اگر آپ چاہیں تو میں خدا کے نام درخواست لکھ دیتا ہوں۔"

ماہ رمضان میں ایک بار پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سعید اللہ اور پروفیسر عبدالواحد علامہ اقبال کے گھر پر حاضر ہوئے، کچھ دیر بعد مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر بھی تشریف لے آئے۔ افطاری کے وقت علامہ نے گھنٹی بجائی اور اپنے نوکر کو بلایا اور اس سے کہا۔

" افطاری کے لئے سنگترے، کھجوریں کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو ہو سکے سب لے آؤ۔" سالک نے عرض کی۔

" اقوہ! اتنا سامان منگوانے کی کیا ضرورت تھی ؟" علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

" سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جما دیں، کچھ نہ کچھ تو لائے گا ؟"

علامہ اقبال کو بچپن میں استاد نے املا لکھائی تو انہوں نے "غلط" کو "غلت" لکھ دیا" یعنی "ط" کی جگہ "ت" ڈال دیا" اُستاد نے کہا "غلط کو "ط" سے لکھا جاتا ہے"
انہوں نے جواب دیا "جناب! غلط کو غلت ہی لکھنا چاہیئے"

علامہ اقبال کو حکومت کی طرف سے "سر" کا خطاب ملا تو انہوں نے اسے قبول کرنے میں یہ شرط رکھی کہ ان کے اُستاد مولانا میر حسن کو بھی شمس العلماء کے خطاب سے نوازا جائے، اعلیٰ حکام نے یہ سوال اُٹھایا کہ ان کی کوئی تصنیف نہیں، انہیں کیسے خطاب دیا جاسکتا ہے!
علامہ نے فرمایا "اُنکی (یعنی مولانا کی) سب سے بڑی تصنیف خود میں ہوں"
چنانچہ حکومت کو ان کے استاد کو شمس العلماء کا خطاب دینا پڑا۔

انجمن حمایت اسلام کے مشاعرے میں ملک کے نامور شعراء جمع تھے، ان دنوں مولانا حالیؔ بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے، اور اقبال ابھی نوجوان شعراء میں شمار ہوتے تھے، جب مولانا حالیؔ کی باری آئی تو انہوں نے اپنے کلام والا کاغذ پاس بیٹھے ہوئے علامہ صاحب کو پکڑا دیا، علامہ اقبال اُٹھے اور حاضرین پر ایک نظر ڈال کر گویا ہوئے ع
گویا کہ میں نبی ہوں . . . . . .
لوگ اس غیر متوقع مصرعے پر حیران رہ گئے، ابھی وہ بات کی نوعیت بھی سمجھ نہ پاتے تھے کہ آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے، اب تو حاضرین میں کھلبلی مچ گئی آہستہ آہستہ ان کی کھُسر پھُسر نے واضح رنگ اختیار کر لیا، لوگ اس زمانے

میں نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کو آسانی کے ساتھ معاف نہ کرتے تھے اس سے پیشتر کہ لوگ آپ کے دعوئ نبوت کو جھٹلاتے اور آپ کے خلاف کوئی واضح کارروائی کرتے۔ آپ نے فرمایا ؎

گویا کہ میں نبی ہوں اشعار کے خدا کا
قرآن بن کر اُترا مجھ پر کلام حالی

یہ سُننا تھا کہ حاضرین داد دینے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کافی دیر تک تالیوں اور تعریفی کلمات کا شور برپا رہا۔

مولانا ظفر علی خاں

کانگرس سے الگ ہونے کے بعد ایک روز مولانا ظفر علی خاں بازار میں جوتوں کی ایک دوکان پر کھڑے تھے کہ سامنے سے کانگرس کا جلوس آتا دکھائی دیا۔ مولانا نے اُسی وقت یہ شعر کہا ؎

کانگرس آرہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے بڑھ کے دُوں جوتا

سر محمد شفیع خاں نے جب اپنی لیگ بنالی تو مولانا نے کہا ؎

کون کہتا ہے بیکار ہے لاہور کی لیگ
ملک سے بر سر بیکار ہے لاہور کی لیگ

مولانا حسرت موہانی نے جب ستیہ گرہ کیا تو پولیس انہیں گرفتار کرنے آئی مولانا بھی ایک طبیعت کے لیڈر تھے۔ انہوں نے کہا۔

"میں اپنی گرفتاری میں تم کو کیوں مدد دُوں، میں تو نہیں چلتا، تمہیں غرض ہو تو لے چلو" چنانچہ چار پولیس والے انہیں اُٹھا کر موٹر تک لے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اخبار "زمیندار" میں لکھا۔ "حضرت عیسٰی تو ایک گدھے پہ چڑھا کرتے تھے مگر مولانا حسرت موہانی نے بیک وقت چار گدھوں پر سواری کی"

"انقلاب" میں مولانا سالک نے ایک مرتبہ لکھا کہ یہ خلافت کی بلّیاں کیوں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں؟

مولانا نے "زمیندار" کے کالم "نکاہات" میں جواب دیا جس میں یہ چبھتا ہوا فقرہ بھی تھا۔ "کیوں حضرت! خلافت کے ابوہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"

بچہ سقہ کے کابل پہنچنے اور امان اللہ خاں کے بھاگنے کی خبر آئی تو مولانا نے برجستہ یہ دو شعر کہے ؎

گدھوں کی آج کل کابل میں ہے فراوانی
گماں ہوتا ہے یہ انساں وہاں پیدا نہیں ہوتے
ہوا کرتے ہیں پیدا رات دن سقوں کے ہاں بچے
مگر ہر روز امان اللہ خاں پیدا نہیں ہوتے

ایک صحبت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے برابر والی کرسی پر مولانا ظفر علی خان بیٹھے ہوئے تھے، مولانا آزاد نے پینے کے لئے پانی مانگا اس پر ایک معمّر سفید ریش بزرگ اُٹھے اور پانی کا گلاس نہایت عقیدت سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا، مولانا نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے برجستہ فرمایا۔ ع

لے کے خود پیرِ مغاں ساغر و مینا آیا

اس پر مولانا ظفر علی خاں نے فوراً گرہ لگائی۔ ع

مے کشو! شرم تم کو پھر بھی نہ پینا آیا

ہندوؤں کے اخبار پرتاب کے ایڈیٹر نانک چند ناز کو اپنی شاعری پر ناز تھا' وہ اکثر مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کا جواب دیتے وقت ان پر چوٹ کر جاتا تھا' ایک دفعہ اس نے ایک نظم کہی جس کا قافیہ "بھنتے' اتنے" وغیرہ تھا۔ اس کا ایک شعر تھا ؎

زمیندار اور لائے گا کہاں سے قافیے چُن کر
کہ جتنے قافیے تھے اس زمیں میں آ گئے اتنے

مولانا ظفر علی خاں نے ایک طویل نظم میں اس کا جواب دیا' ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مہاشے ناز کی شانِ نواسنجی کے میں صدقے
بھلایا اپنے گھر کا قافیہ ہی کیوں شری یت نے

گاندھی کی لنگوٹی کا مسلمان کے تہمد سے موازنہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا ؎

تونے گاندھی کی لنگوٹی کا جہاں رکھ لی ہے شرم
مرے تہمد کو بھی یا رب فتح دے پتلون پر

کانگرسی ملّاؤں نے مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی مخالفت کی' تو مولانا نے ان پر پھبتی کستے ہوئے لکھا ؎

کانگرس نے پال رکھے ہیں عرب کے چند اونٹ   عالم اسلام ہے ان بے مہاروں کے خلاف

جگرؔ مُرادآبادی

ایک بار مشاعرہ ہورہا تھا ایک مسلم الثبوت استاد اُٹھے اور انہوں نے ایک طرح مصرعہ دیا۔ ع چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب

بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا ان میں سے ایک شاعر نے قسم کھائی کہ جب تک گرہ نہ لگائیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ چنانچہ وہ ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اُونچی آواز سے الاپتے ––

چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب

ایک روز وہ دریا کے کنارے یہی مصرعہ الاپ رہے تھے کہ ادھر سے ایک کم سن لڑکا گذرا جونہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا وہ لڑکا بول اُٹھا۔ ع

کسی بُلبل کا دل جلا ہوگا

شاعر نے بھاگ کر اس لڑکے کو سینے سے لگایا یہی لڑکا بڑا ہو کر جگرؔ مراد آبادی کے نام سے مسلم الثبوت استاد بنا۔

بھوپال میں جگرؔ مراد آبادی کے اعزاز میں ایک مخصوص محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شعرائے بھوپال اور دوسرے نامور کہنہ مشق شعرا کے علاوہ بعض گمنام اور نو آموز شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ اتفاق سے اس مشاعرہ میں ایک دو مشہور شعرا کے بعض اشعار بہت ناقص تھے اور ایک مبتدی شاعر کی غزل کا ایک شعر جگرؔ صاحب کو غیر معمولی طور

پر پسند آیا۔

اگلے روز جب جگرؔ صاحب کے کسی بے تکلف دوست نے مشاعرہ کے متعلق ان کا تاثر دریافت کیا تو جگرؔ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔

"صاحب! قدرت کی طرف سے کسی اچھے شاعر کو سزا ملتی ہے تو اس پر کوئی گھٹیا شعر نازل ہو جاتا ہے' اور جب کسی اچھے شعر کو سزا ملتی ہے تو وہ کسی گھٹیا شاعر پر نازل کر دیا جاتا ہے۔"

ایک بار جوش ملیح آبادی نے جگرؔ صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا عبرتناک حالت ہے آپ کی' شراب نے آپ کو زندہ مولوی بنا دیا اور آپ اپنے مقام کو بھول بیٹھے' مجھے دیکھئے کہ میں ریل کے کھمبے کی طرح اپنے مقام پر آج بھی وہاں اٹل کھڑا ہوں' جہاں آج سے کئی سال پہلے تھا۔"

جگرؔ صاحب نے جواب دیا "بلا شبہ آپ ریل کے کھمبے ہیں' اور میری زندگی ریل گاڑی کی طرح ہے' جو آپ جیسے ہر کھمبے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہر مقام سے آگے اپنا مقام بناتی جا رہی ہے۔"

جگرؔ مراد آبادی کے کسی شعر کی تعریف کرتے ہوئے کسی من چلے نے اُن سے کہا۔

"حضرت! اس غزل کے فلاں شعر کو میں نے لڑکیوں کے ایک ہجوم میں پڑھا اور اور پٹنے سے بال بال بچا۔"

جگرؔ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"عزیزم! ضرور اس شعر میں کوئی خامی ہوگی ورنہ آپ ضرور پڑھتے۔"

دہلی میں محمود علی خاں نے جگر صاحب کے اعزاز میں ایک دعوت دی تمام مہمان تقریباً ایک دائرہ کی شکل میں اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب جو کافی دیر سے تشریف لائے چپکے سے ایک کرسی کے پیچھے کرسی رکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔ جگر صاحب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا اور کہنے لگے۔

"ارے بھائی برابر آجاؤ" اس طرح کیوں بیٹھ گئے، جیسے ہندوستان کے نقشے میں سیلون۔"

ایک محفل میں جوش ملیح آبادی اور جگر دونوں تھے، جوش کہتے تھے "پہلے میں پڑھونگا" اور جگر صاحب کا فرمان تھا کہ "پہلے میں پڑھوں گا" تھوڑی دیر تک یہ تکلف ہوتا رہا۔ آخر جگر نے کہا۔

"لیجئے میں اپنے چار شعر سناتا ہوں۔"

جوش نے کہا "چار نہیں پانچ۔"

جگر بولے "دیکھا آپ نے وہی شیعہ والی بات کی۔"

فراق گورکھپوری

فراق صاحب اُردو فارسی ہندی انگریزی کئی زبانوں کے ماہر تھے مگر وہ دلدادہ اُردو زبان کے تھے۔ ایک بار ہندی کے ایک ادیب اور اُن کے درمیان زبان کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، بحث کے دوران فراق صاحب نے فرمایا۔

"کھڑی بولی پر ہندی نثر کی بنیاد للّو لال جی نے ڈالی تھی، وہ للّو لالیت ابھی تک پائی جاتی ہے۔"

ایک مذہبی قسم کے بزرگ فراق کے ساتھ کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے، دوران بحث وہ بار بار گناہ اور ثواب کے الفاظ استعمال کر رہے تھے، فراق نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"کیوں صاحب! یہ گناہ کیا چیز ہے؟"

"گناہ!۔۔۔ یعنی گناہ کیا چیز ہے؟۔۔۔ گناہ گناہ ہے اور کیا؟"

فراق کے اس غیر متوقع سوال پر وہ بوکھلا سے گئے، لیکن چند لمحوں کے تامّل کے بعد کہنے لگے۔

"گناہ وہ کام ہے جو لوگوں کی نظر سے چھپ کر کیا جائے۔"

"یعنی جیسے میں پیشاب کرتا ہوں"، فراق نے جواب دیا۔

اس مختصر سے جواب سے ان بزرگ کی پیشانی یوں عرق آلود ہو گئی جیسے انہوں نے خود کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہو۔

فراقؔ صاحب اور ایک کمیونسٹ افسانہ نگار کی بحث ہو گئی، اُس نے فراقؔ سے کہا" میں حکومت کے ٹکڑوں پر آپ کی طرح نہیں پلا ہوں "
فراقؔ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔
" مگر میں اپنی حکومت سے تنخواہ لیتا رہا ہوں، روسی حکومت کے ٹکڑوں پر نہیں پلا"

شعراؔ کی ایک دعوت میں جگن ناتھ آزادؔ اور فراقؔ گورکھپوری پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے، جب کھانا ان کے سامنے لایا گیا تو فراقؔ نے آزادؔ سے مخاطب ہو کر کہا۔ " کھائیے آزادؔ صاحب، نہایت لذیذ گوشت ہے "
آزادؔ نے جواب میں ایک عام سا جملہ چست کیا۔
" آپ کھائیے، ہم تو روز کھاتے ہیں "
فراقؔ نے فی الفور آزادؔ کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔
" لیکن یہ خالص گھی کا پکا ہوا ہے "

ایک بار فراقؔ صاحب ایک مشاعرہ میں بلائے گئے، ان کا کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اسی دن گوپی ناتھ امنؔ سے ان کے دفتر میں ملے، منتظم مشاعرہ عرشؔ صاحب کا دفتر بھی اس عمارت میں تھا، انہیں اطلاع دی گئی۔ انہوں نے آکر کہا۔
فراقؔ صاحب! اچھا ہوا آپ آگئے ورنہ ہمارا مشاعرہ بے دولہا کی برات ہوتا
فراقؔ صاحب نے جواب دیا۔
" مگر میں تو اپنے آپ کو بے برات کا دولہا سمجھتا ہوں "

ایک مشاعرہ میں فراق کے بعد سامعین کی طرف سے ایک نودان شاعر زبیر رضوی کا کلام سننے کی فرمائش کی گئی۔

مشاعرے کے سیکریٹری نے زبیر کو مائیک پر بلایا تو وہ نہایت نیازمندی سے جھکتے ہوئے کہنے لگا۔

" قبلہ! فراق صاحب کے بعد میں اپنے شعر کیونکر پڑھ سکتا ہوں"

فراق نے یہ سُن کر بڑی نیازمندی سے فرمایا۔

" واہ میاں! تم اگر میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو میرے بعد شعر کیوں نہیں پڑھ سکتے۔

ایک ماضی پرست ادیب کسی جگہ فخریہ انداز میں بیان کر رہے تھے۔

" پچھلے دنوں اپنے مکان کی تعمیر کے لئے مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا جب زمین کھدوائی گئی تو بجلی کی تاریں دستیاب ہوئیں اور وہ بجلی کی تاریں اندازاً دو تین ہزار سال پرانی تھیں" اور اس کے بعد خود ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہنے لگے " اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو تین ہزار سال پہلے بھی ہمارے دیس میں بجلی موجود تھی "

فراق گورکھپوری بھی وہاں موجود تھے" جب یہ بات سُنی تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے" جی ہاں! اور میں نے اپنا مکان بنوانے کے لئے جب زمین کھدوائی تو کچھ بھی نہ ملا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرانے وقتوں میں ہمارے ملک میں وائرلیس بھی رائج تھا"

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کسی محفل میں ناچ دیکھ رہے تھے" پہلے اس میں کتھک ناچ ہوا اور بعد ازاں تانڈو ناچ جو کسی زمانے میں شیو دیوتا کا ناچ

سمجھا جاتا تھا۔
فراقؔ صاحب نے حضرت جوشؔ سے مخاطب ہوکر مسکراتے ہوئے کہا۔
" وہ میری شاعری تھی، یہ آپ کی شاعری ہے "

ایک مشاعرے میں فراقؔ گورکھپوری غزل پڑھنے سے پہلے فرمانے لگے۔
" مجھ سے رات کو اب پڑھا نہیں جاتا اور یوں بھی رات کو میں نے اللہ میاں کو اپنے دربار میں آنے سے منع کر دیا ہے "
اس پر گوپی ناتھ امنؔ نے کہا " میری دعا ہے کہ اللہ میاں بھی اپنے دربار میں آپ کو نہ بلائیں " انہوں نے برملا کہا۔ " مگر آپ اپنے دربار میں بلاتے رہیئے گا "

ایک بار فراقؔ صاحب ایک طویل غزل پڑھ رہے تھے، ایک بے تکلف دوست نے فراقؔ صاحب سے کہا کہ ابھی تک سامعین نے آپ کو ہوٹ نہیں کیا، فراقؔ صاحب نے سامعین سے مخاطب ہوکر کہا۔
" حضرات میری اجازت کے بغیر مجھے ہُوٹ نہ کیجئے گا "

دہلی کلاتھ مل کے ایک مشاعرے میں فراقؔ صاحب غزل پڑھنے آئے تو انہوں نے کہا۔
" یہ غزل میں نے ایک پُرانے پنشن یافتہ معشوق سے مخاطب ہوکر لکھی ہے "
اس پر گوپی ناتھ امنؔ نے کہا " خیال فرمائیے جب معشوق پنشن یافتہ ہے تو بھلا فراقؔ صاحب کس منزل پر ہوں گے۔

جوش ملیح آبادی

ایک محفل میں جوش ملیح آبادی اپنی نظم سنا رہے تھے تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

" دیکھئے ! کم بخت پٹھان ہوکر کیسے عمدہ شعر پڑھ رہا ہے "

جوش صاحب نے فوراً بیدی صاحب کو اس کا جواب دیا۔

" اور .... ظالم سکھ ہوکر کیسی اچھی داد دے رہا ہے "

ایک بار ایک کالج کے مشاعرے میں جوش صاحب اپنا کلام سُنا رہے تھے کہ کسی گوشے سے کچھ ہوٹنگ کی سی آواز آئی' انہوں نے فوراً یہ رباعی پڑھی سے

آتی ہے مشاعروں میں بُو گھوڑے کی — حاجی اللہ بخش کی' میاں نورے کی
اے جوش میں عطرِ سخن کے اپنے — بھرتا ہوں شیشیوں میں تاڑوبے کی

دہلی کے ایک مشاعرے میں جب کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ جوش بھی آئے تو وہاں گورکھ نہال سنگھ نے ان کا خیر مقدم کیا' جوش صاحب نے نہایت ترحم آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کنور صاحب سے کہا۔

" دیکھئے ! یہ بیچارے مشاعرہ میں ایسے دکھائی دے رہے ہیں' جیسے رفیع احمد قدوائی کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سنتے ہوئے یا کسی حجرے میں تراویح پڑھتے ہوئے پکڑا جاؤں "

"قبلہ جوشؔ صاحب! آپ آزاد نظم کیوں نہیں لکھتے؟"
"ایک بار کوشش تو کی تھی۔"
"تو پھر ——— ؟"
"تمام رات بزعمِ خود آزاد نظمیں کہتے رہے لیکن صبح اٹھ کر دیکھا تو تمام اشعار تھا"

جوشؔ صاحب پل بنگش میں جس محلّہ میں آکر رہے اس کا نام تقسیمِ وطن کے بعد سے نیا محلہ ہو گیا تھا۔ وہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد جوشؔ صاحب کو معلوم ہُوا کہ پہلے اس کا نام "رنڈی والا باغ" تھا۔ بڑی اُداسی سے کہنے لگے۔
"کیا بد مذاق لوگ ہیں! کتنا اچھا نام بدل کر رکھ دیا۔"

جوشؔ صاحب دفتر کے لئے تیار ہو رہے تھے اور گھر میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے باتوں کی محویت کے عالم میں وہ اکثر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ جب اچکن پہن کر ٹوپی لگا کر باہر جانے لگے تو ان کی بیگم نے کہا۔
"آپ پاجامہ پہننا بھول گئے ہیں۔"

جوشؔ صاحب مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف بہت سختی سے لکھتے رہتے ہیں ایک بار جب وُہ دلّی میں تھے تو منشی بشیشور پرشاد منورؔ نے ان سے کہا کہ جوشؔ صاحب آپ اتنی سختی سے کیوں لکھتے ہیں کچھ نرمی سے لکھیں تو کون لفظوں پر زیادہ اچھا اثر ہو۔ جوشؔ صاحب نے جواب دیا۔ "منورؔ صاحب! میں پٹھان ہوں لکھ پڑھ گیا اسلئے قلم استعمال کرنا پڑتا ہے"

ورنہ یہاں ہمیشہ تلوار سے کام چلتا رہا ہے۔"

جوش صاحب کو ایک دوست اپنے یہاں تصویروں کا البم دکھا رہے تھے، انہوں نے ایک تصویر دکھا کر پوچھا "بتایئے یہ کس کی تصویر ہے ؟"

جوش صاحب نے فرمایا "کوئی بے وقوف سا شخص معلوم ہوتا ہے"

انہوں نے گردن جھکالی، جوش صاحب کچھ کھٹکے اور پوچھنے لگے۔

"آخر یہ کس کی تصویر ہے ؟"

انہوں نے آہستہ سے جواب دیا " میرے والد کی"

جوش صاحب مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گئے، اتفاق سے وہاں پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے ہوئے تھے اور کسی سیاسی گفتگو میں مشغول تھے جوش صاحب نے کوئی دس منٹ انتظار کیا اور اس کے بعد یہ شعر لکھ کر مولانا کے پاس اندر بھیجا سہ

نامناسب ہے خون کھولانا

پھر کسی اور وقت مولانا

اس پرچہ کے اندر پہنچتے ہی پنڈت جی باہر آئے اور جوش کو اندر لے گئے

جوش صاحب جاڑے کی ایک رات کسی دوست سے ملنے گئے، اندر اطلاع کی، تو نوکر نے آکر جواب دیا کہ " نواب صاحب نہیں ہیں" جوش صاحب کو کچھ شک گذرا، کوفت تو بہت ہوئی لیکن خاموشی سے واپس چلے آئے کچھ دنوں کے بعد ایسا

اتفاق ہُوا کہ وہی صاحب حضرت جوشؔ سے ملنے ان کے گھر چلے آئے تو جوش صاحب نے چھت پر کھڑے ہو کر فرمایا "میں نہیں ہوں"

دلّی میں ایک رئیس کے مکان پر مختصر سی صحبت شعروسخن تھی، جس میں زیادہ تر شعراء پینے والوں میں سے تھے۔ جب دَور چل رہا تھا، تو نواب صاحب نے پانی مانگا۔ جوش صاحب نے فرمایا: ع

پانی پی پی کے کوستے ہیں ہمیں

اور شعراء کو مصرعہ لگا کر مطلع بنانے کا چیلنج کیا۔ جب کوئی بھی ہم قافیہ مصرعہ نہ لگا سکا تو خود ہی کہنے لگے ع

پالتے ہیں نہ پوستے ہیں ہمیں
پانی پی پی کے کوستے ہیں ہمیں

ایک بار جوشؔ کے سامنے اقبال کی فلسفیانہ اور اسلامی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا انہوں نے بحث میں حصہ تو نہ لیا صرف یہ شعر فرما دیا ؎

یہ شاعری ہے عرش کی رخصت گری نہیں
یعنی خدانخواستہ پیغمبری نہیں

ایک روز جوشؔ صاحب کنور مہندر سنگھ بیدی سے ملنے آئے تو کنور صاحب ٹیر بازوں سے گھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ٹیروں کی لڑائی بند ہوئی تو ایک درباری قاتی آیا اور اس نے شہر میں جلد ہونے والے ایک دنگل کے سلسلہ میں کنور صاحب سے کچھ

ضروری مشورے لئے، اس کے بعد کنور صاحب ایک قوّال سے مصروفِ گفتگو ہو گئے اور دیر تک فنِ موسیقی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ اتنے میں کچھ اور لوگ آگئے اور اپنے سرکاری کاموں کے سلسلے میں کنور صاحب سے سفارش کرنے کے لئے مِنّت سماجت کرنے لگے۔ اس دَوران میں کنور صاحب ٹیلی فون کے ذریعے اپنے دفتر کے ہیڈ کلرک کو دفتری کاموں کے سلسلے میں ضروری ہدایات بھی دیتے رہے۔ جب ان کے ہجوم سے فارغ ہو کر کنور صاحب نے جوشؔ صاحب سے رجوع کیا اور ان سے کوئی نئی نظم سنانے کی فرمائش کی تو جوشؔ صاحب نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "کنور صاحب آپ نظم حُسن کو کیا کریں گے؟ آپ کی زندگی تو غزل کے مزاج کی طرح ہے، جس کے ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق ہی نہیں۔"

ایک بار روشن دہلوی کے مکان پر ایک مختصر سی نشست تھی جس میں کھانے کا بھی انتظام تھا اور رہنے کا بھی۔ حضرت جوشؔ کو ان کے کلام پر داد بھی بہت ملی، سرور کے عالم میں خوش ہو کر کہنے لگے۔

"سب اصیل دلی والے مرگئے، اب تو دلّی نہیں رہ گئی ہے۔"

جوشؔ صاحب کے صاحبزادے سجّاد کی شادی بھی بے تکلف محفل تھی۔ اس میں جناب ابن الحسن فکرؔ بھی موجود تھے، جو حضرت جوشؔ کے جگری دوست تھے اور اب اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس محفل میں ایک طوائف نے بڑے سُریلے انداز میں جوشؔ ہی کی ایک غزل گانی شروع کی تو فکرؔ صاحب بولے۔

"اب غزل تو یہ گائیں گی اور جب داد ملے گی تو سلام جوشؔ صاحب کریں گے۔"

بشیشور پرشاد منور نے بہت سی مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں یہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی ہیں جوش صاحب مذاہب سے بیزار ہیں اور انہیں انسانی پس ماندگی کا مظہر سمجھتے ہیں اور منور صاحب سے ان کی بے تکلفی بھی ہے اس لئے کہنے لگے۔

"منور صاحب! ہم تو مرنے کے بعد سیدھے دوزخ میں جائیں گے، لیکن آپ کو بڑی کشمکش کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ کوئی رشی یا اوتار ایک طرف کھینچے گا اور کوئی ولی یا نبی دوسری طرف۔"

بمبئی کی ایک معروف ادب پرور اور بوڑھی مغنیہ کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہو رہی تھی، جس میں جوش، جگر، حفیظ جالندھری، مجاز اور ساغر نظامی جیسے شعراء بھی شریک تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی، جس کی کسن آنکھیں بجائے خود کسی غزل کے نمناک شعروں کی طرح حسین تھیں، ایک مختصر سی آٹو گراف پر دستخط لینے لگی۔ اس جہاں دیدہ مغنیہ کی موجودگی میں یہ نوعمر حسینہ زندگی کے ایک تضاد کو نہایت واضح انداز میں پیش کر رہی تھی، چنانچہ اس تضاد کے پیش نظر جگر مراد آبادی نے آٹو گراف بک میں لکھا ؎

ازل ہی سے چمن بندِ محبت ۔۔۔ یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے ۔۔۔ وہیں اک پھول مرجھا رہا ہے

اور جب حفیظ صاحب کی باری آئی تو انہوں نے معصوم لڑکی کے چہرے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا ؎

ے معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

اس کے بعد آٹوگراف بک دوسرے شاعروں کے پاس سے ہوتی ہوئی جب جوش صاحب کے سامنے آئی تو انہوں نے لکھا۔

"آٹوگراف بک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گدھے اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔"

دراصل جہاں جگر اور حفیظ کے برمحل شعروں نے ان کے حساس جمال کو تازگی اور شگفتگی بخشی وہاں دوسرے کئی شاعروں کے اوٹ پٹانگ شعر انہیں ناگوار گزرے تھے۔

بمبئی میں جوش صاحب ایک ایسے مکان میں ٹھہرے جس میں اوپر کی منزل پر ایک اداکارہ رہتی تھی مکان کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ انہیں دیدار نہ ہو سکتا تھا لہذا انہوں نے یہ رُباعی لکھی ؎

میرے کمرے کی چھت پہ ہے اس بُت کا مکان
جلوے کا نہیں ہے پھر بھی کوئی امکان
گویا اے جوش میں ہوں ایسا مزدور
جو بھوک میں ہو سر پہ اُٹھائے ہوئے خوان

جوش صاحب کے والد نے ان کے ہاتھوں اپنے استاد حضرت جلال لکھنوی کے پاس گھی بھجوایا مگر انہوں نے واپس کر دیا اس سے پہلے انہوں نے کوئی تحفہ یا سوغات واپس

نہ کی تھی چنانچہ وہ حضرت جلال کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ کیا خطا ہوئی جو آپ نے گھی واپس کر دیا۔ حضرت جلال نے برہمی کے ساتھ فرمایا۔

" واپس نہ کرتا تو کیا کرتا ۔ تم نے ایسا بدتمیز ملازم بھیجا تھا جس نے میرے دروازے پر آکر پکارا ' جلال ہوت ' "

جوش صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے اور حضرت جلال لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے، لیکن ان کی زندگی میں ہی جوش صاحب کی شاعری ان سے زیادہ مقبول ہونے لگی تو انہوں نے کہا۔

" دیکھو بھئی جوش! میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس دولت مجھ سے زیادہ ہو، ثروت مجھ سے زیادہ ہو، جاہ و جلال مجھ سے زیادہ ہو، عمر مجھ سے زیادہ ہو لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے بڑے شاعر بھی کہلاؤ۔"

پنڈت ہری چند اختر اگرچہ میگساروں کا دم بھرتے تھے لیکن پینے پلانے سے خود دور رہتے تھے، ایک بار جوش کے ساتھ میخانے میں گئے جوش صاحب اور دیگر شعراء تو پینے پلانے میں مشغول ہو گئے لیکن اختر صاحب بیٹھے رہے، جوش صاحب کو کچھ خیال آیا تو انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگے۔

" پنڈت جی یہ آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

" بار کا مینو دیکھ رہا ہوں صاحب!" اختر نے جواب دیا۔

" کم سے کم شراب کی قسموں اور ان کی قیمتوں سے تو واقف ہو جاؤں۔"

"ہوں! جوشؔ صاحب نے وہسکی کے کچھ گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے کہا۔
"لیکن! بار کا ٹائمنگ پڑھتے ہوئے آپ ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے کوئی نامرد کوک شاستر پڑھ رہا ہو۔"

جوشؔ ملیح آبادی اپنے ایک شاعر دوست بسملؔ سعیدی کے ساتھ شام کے وقت ایک رئیس کے ہاں اس نیت سے پہنچے کہ وہ کچھ کھلائے پلائے گا۔ رئیس نے ان کا خیر مقدم تو بڑی گرم جوشی سے کیا لیکن پینے پلانے کے سلسلے میں ٹھنڈی بے دلی کے ساتھ صرف ایک بار پوچھا۔

"کیوں جوشؔ صاحب کچھ پیجئے گا؟"

جوشؔ صاحب نے معنی خیز نظروں سے بسملؔ کی طرف دیکھنے کے بعد اپنی روایتی وضع داری سے کام لیتے ہوئے کہا "نہیں جناب نوازش آپ کی۔"

واپس آتے ہوئے انہوں نے بسملؔ سے پوچھا۔

"اس رئیس زادے نے جس انداز سے ہمیں پینے کی دعوت دی اُسے دیکھا؟" اور پھر بسملؔ کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگے۔

"اس انداز کے اظہار کے لئے کوئی مناسب لفظ بتاؤ۔"

بسملؔ نے چند لمحوں تک فکر کرنے کے بعد کہا۔ "اُردو میں تو غالباً ایسا کوئی لفظ نہیں، البتہ عربی میں اس موقع پر ایک لفظ ہے "استنکار"

جوشؔ صاحب مسکراتے ہوئے کہنے لگے "اسے کہتے ہیں۔ ع

اللہ رے تری دعوت انکار طلب

جوش صاحب کو اپنی پنشن نکلوانے کے لئے کسی اعلیٰ گزیٹڈ افسر سے اپنے بقید حیات ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا تھا انہوں نے شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر دہلی کو جو کا غذات برائے تصدیق بھیجے ان کے ساتھ منسلک خط کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا۔ "جوش مرحوم"

کسی مشاعرے میں ایک نومشق شاعر اپنا غیر موزوں کلام پڑھ رہے تھے، اکثر شعرا آداب محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے، لیکن جوش ملیح آبادی پورے جوش و خروش سے ایک ایک مصرعہ پر داد وتحسین کی بارش کئے جا رہے تھے۔

گوپی ناتھ امن نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"قبلہ!" یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

"منافقت" جواب ملا۔

پنڈت ہری چند اختر

کسی مشاعرے میں ایک شاعر اپنا یہ شعر سنا رہے تھے ۔
ضرورت ہی کہاں تھی بادۂ گلرنگ کی لیکن
تری بے التفاتی مجھ کو مے خانہ میں لے آئی

شعر سننے کے بعد کسی نے ہری چند اختر سے پوچھا ۔
" کیوں پنڈت جی ! یہ التفاتی کیا چیز ہے ؟"
" التفات کی بیوی " اختر نے اسی لمحے انکشاف کیا ۔

مولانا انور صابری بہت مقبول شاعر ہیں ان کے آتے ہی لوگ ان کے کلام کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں ایک مشاعرے میں جب وہ شعر پڑھنے کیلئے مائکروفون کے قریب آئے تو بہت سے فوٹو گرافر ان کا فوٹو لینے آگے بڑھے تو انھوں نے از راہِ انکسار کہا " مجھ بڈھے کا فوٹو کیا لیتے ہو نوجوان حسینوں کا فوٹو لو "
پنڈت ہری چند اختر پاس ہی موجود تھے فوراً جھک کر بولے ۔
" آپ کا فوٹو لے رہے ہیں بچوں کو ڈرانے کے لئے ۔"

ایک بار اختر صاحب بہت گھبرائے ہوئے عرش ملسیانی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے ۔" مجھے ڈھائی سو روپے دیدو ۔"

عرش صاحب نے پوچھا' کیا بات ہے ؟
نام لے کر کہنے لگے کہ فلاں صاحب کو پانچ سو روپوں کی ضرورت ہے' انہوں نے قرض مانگا ہے' عرش صاحب نے فرمایا۔
" مگر یہ روپے آپ کو نہیں ملیں گے"۔
جواب دیا" یہ تو میں بھی جانتا ہوں' اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

مالیر کوٹلہ کے ایک مشاعرہ میں پریم وار برٹنی جب مشاعرہ کے دوران سامعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے سٹیج کی طرف بڑھنے لگے تو وہ بُری طرح بنے ہوئے تھے' پنڈت ہری چند اختر نے کسی سے کہا" لیجیے! وہ پریم وار برٹنی بھی آرہے ہیں"
اختر نے پریم کے مدہوش چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا
" آرہے ہیں؟ یہ مردود تو سچ مچ مرد ہے' نام سے تو میں سمجھا تھا کوئی خاتون ہونگی"

کسی مشاعرے میں ایک "لحیم شحیم اور علاقہ" قسم کے شاعر غزل پڑھ رہے تھے اور ہر شعر کو شروع کرنے سے پہلے کہتے۔" دیکھئے کس پائے کا شعر ہے"
جب وہ اس جملے کو تین بار دُہرا چکے اور چوتھے شعر کی بسم اللہ پھر انہی الفاظ سے کی تو ہری چند اختر ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کر بولے
" چار پائے کا؟"

جوش ملیح آبادی اور پنڈت ہری چند اختر کے درمیان زبان کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی

جوشؔ صاحب کا رویہ بحث کے دوران میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ۔ ع
مستند ہے میرا فرمایا ہُوا

لیکن اخترؔ صاحب بھی اڑیل قسم کے ادیب ہیں جب بحث نے طوالت پکڑی تو اخترؔ صاحب نے فرمایا۔

" مَیں دلّی والوں کی زبان کو ماننے کو تیار ہوں' میں لکھنؤ والوں کی زبان ماننے کو تیار ہوں' لیکن مَیں ملیح آباد کے باغبانوں کی زبان نہیں مانتا "

ایک ہندو لالہ کی شادی میں مولانا عبدالمجید سالکؔ مولانا غلام رسول مہرؔ اور پنڈت ہری چند اخترؔ شریک تھے' میزبان کی طرف سے پُرتکلف وشنو کھانے کے بعد جب ہر مہمان کو "جل جیرا" کا ایک گلاس پیش کیا گیا تو مہرؔ صاحب نے متعجب ہو کر اخترؔ صاحب سے کہا۔

" پنڈت جی! یہ جل جیرا کیا چیز ہے؟

اخترؔ صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی سالکؔ صاحب کہنے لگے۔

" پی بھی لے یار! یہ ہندوؤں کا سوڈا واٹر ہے "

اور اخترؔ صاحب دونوں کا منہ تکنے لگے۔

ایک بار اُردو ادب کے گرتے ہوئے معیار پر چند ادیبوں اور شاعروں میں بحث ہو رہی تھی' اس محفل میں پنڈت ہری چند اخترؔ بھی موجود تھے' جب اُن سے اظہارِ خیال کے لئے کہا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے زیادہ ادب کا زوال اور کیا ہوگا کہ ہم جیسے چغد بھی اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔

سالانہ امتحان میں مضمون کا موضوع تھا "اتفاق"

اُستاد نے طلبار کو بتار کھا تھا کہ جب کسی چیز پر مضمون لکھنا ہو تو تین چیزوں کا خیال رکھو (۱) تمہید - یعنی اس چیز کی وضاحت جس پر مضمون لکھنا ہو۔

(۲) فوائد - پھر اس کے فائدے بیان کرو۔

(۳) نقصانات - اور آخر میں اس کے نقصانات تحریر کرو۔

ایک طالب علم کو استاد کا یہ سبق حرف بحرف یاد تھا۔ چنانچہ اس نے تمہید کے طور پر اتفاق کی معنویت پر چند جملے تحریر کئے، پھر اس کے فائدے گنوائے اور مثال کے طور پر بوڑھے اور اس کے بیٹوں کی وہ کہانی لکھ دی، جس میں بوڑھا اتفاق کی تلقین کرتے ہوئے بیٹوں کو تنکوں کا ایک گٹھا توڑنے کی ہدایت کرتا ہے۔

اور جب اتفاق کے نقصانات لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو اس نو عمر مضمون نگار کا قلم چند لمحوں کے لئے رُک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا لکھے۔

آخر ایک دم اس کی تخلیقی رگ پھڑکی۔ اور اس نے لکھنا شروع کیا۔

" جیسے ہر چیز کے فائدے اور نقصان ہوتے ہیں اسی طرح اتفاق کے بھی بعض نقصانات ہوتے ہیں، جیسے اتفاق سے دو موٹروں کی ٹکر ہو جاتی ہے یا اتفاق سے کوئی گاڑی پٹڑی سے اُتر جاتی ہے اور اس طرح اتفاق سے بعض دفعہ بہت ساجانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے "

اور اتفاق سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کل کا وہ بچہ جس نے یہ مضمون تحریر کیا، آج کا پنڈت ہری چند اختر ہے۔

پنڈت ہری چند اختر کسی مشاعرہ میں غزل پڑھ رہے تھے، سامعین سے اچانک ایک حضرت ڈھکران کے ایک مصرعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگے۔

" اختر صاحب! دوسرے مصرعہ میں الف گر گیا ہے "

" تو پکڑ کر کھڑا کر دیجئے"

اور اختر صاحب کا یہ جواب سُن کر ان حضرات کو خفیف سا ہو کر بیٹھنا پڑا۔

ایک مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر شعر سنانے تشریف لائے تو ان کے کلام سے زیادہ ان کے مضحکہ خیز حلیے نے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔ چھوٹی سی سفید چمک دار داڑھی، سر پر کھدر دھلی ہوئی ٹوپی اور جسم پر گہرے سبز رنگ کا لمبا ساچغہ کسی شخص نے پنڈت ہری چند اختر سے پوچھا

" یہ بزرگ کون ہیں پنڈت جی؟"

اختر صاحب پہلے تو آنکھوں پر چشمہ لگا کر ان حضرت کو غور سے دیکھتے رہے پھر ایک دم چہک کر بولے۔

" شکل وصورت سے تو مولانا نیل کنٹھ دکھائی دیتے ہیں "

ایک صاحب مشاعرے میں اپنی غزل پڑھ رہے تھے، لوگ ان کا کلام سُنتے سنتے تھک گئے تھے، مگر وہ نہ تھکتے تھے، آخر جب غزل تمام ہوئی تو اختر صاحب جو نیم غنودگی کے عالم میں تھے چونک کر بولے۔

" ذرا وہ ۳۵ واں شعر پھر سے پڑھ دیجئے گا "

ایک اور مشاعرے میں ایک صاحب اپنی غزل پڑھ رہے تھے، سامعین میں کچھ عورتیں تھیں، جو شعر بھی سنتی جاتی تھیں اور اپنا سویٹر بھی بُنتی جاتیں۔ جب غزل ختم ہوئی تو اختر صاحب نے فرمایا۔
"اس غزل خوانی کے دوران چوتھائی سویٹر بن گیا۔"

پنڈت ہری چند اختر صاحب کا ایک دوست انہیں راستہ میں مل گیا اور کہنے لگا۔ "پنڈت جی آپ کو دعوت نامہ تو مل گیا ہوگا، آئندہ ہفتہ میرے بڑے لڑکے کی شادی ہو رہی ہے، آج اس کے سہرے کی کتابت کروا نے کے لئے یہاں آیا تھا، اب اُسے چھپوانے کے لئے پریس جا رہا ہوں۔"
اختر صاحب نے کتابت شدہ سہرا اپنے دوست کے ہاتھ سے لیکر پڑھنا شروع کیا اور ایک دو ابتدائی شعر پڑھنے کے بعد ہی پھٹ پڑے۔
"کس اُلّو کے پٹھے نے ان شعروں کو لکھا ہے؟"
اختر صاحب کا دوست محجوب سا ہو گیا اور ان کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک منحنی سے نوجوان کا چہرہ کتابت کے کاغذ کی طرح پیلا پڑ گیا۔
"یہ حضرت ہیں جنہوں نے سہرا لکھا ہے۔" اختر صاحب کے دوست نے کسی مجرم کی طرح پشیمان سے ہو کر اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔
اس نوجوان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اختر صاحب کو اپنی صاف گوئی پر افسوس ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے شاعر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "خوب! تو یہ سہرا آپ نے لکھا ہے! بہت اچھے شعر ہیں، جزاک اللہ لیکن

صاحب، مجھے تو اس کی کتابت دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے، دیکھئے نا، نوشق کاتب نے اچھے بھلے شعروں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔"

چند ادب ذوق حضرات اُردو کے ایک شاعر کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"صاحب! ان کی کیا بات ہے، بہت بڑے شاعر ہیں، اب تو حکومت کے خرچ سے یورپ بھی ہو آئے ہیں۔"

ہری چند اختر نے یہ بات سُنی تو نہایت متانت سے کہا۔ "جناب اگر کسی دوسرے ملک میں جانے سے کوئی آدمی بڑا شاعر ہو جاتا ہے تو میرے والد ملکِ عدم جا چکے ہیں، لیکن خدا گواہ ہے، کبھی ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکے۔"

کسی مشاعرے میں نوح ناروی صاحب ایک غزل پڑھ رہے تھے، جس کی زمین تھی۔ "حالات کیا کیا" "آفات کیا کیا"

جب وہ اپنے اس مخصوص انداز میں اپنے کسی شعر کا مصرعہ اولیٰ فرما رہے تھے

ع یہ دل ہے، یہ جگر ہے، یہ کلیجہ

تو ہری چند اختر جھٹ بول اُٹھے۔ ع

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

ایک مختصر سی نشست میں کنور مہندر سنگھ بیدی اپنا کلام سُنا رہے تھے۔
انہوں نے ایک غزل پڑھی، جس کے قافیہ میں "سود و زیاں" آیا تھا۔ شعر اچھا تھا
مگر جناب شنکر پرشاد نے فرمایا۔
"یہ آپ نے سکھ ہوتے ہوئے بنئے والا قافیہ کیسے باندھ دیا۔"

ہند و پاکستان مشاعرہ میں کنور مہندر سنگھ بیدی غزل پڑھ رہے تھے
زمین تھی ' دنا ہو جیسے ' خُدا ہو جیسے ' غزل گہرے تغزل کے رنگ میں تھی ' گوپی ناتھ امن
نے داد دیتے ہوئے کہا ہو۔ ع۔

ہے وہ انداز جوانی میں کہا ہو جیسے

کنور صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ "جناب مَیں اب بھی جوان ہوں۔"

بسمل شاہ جہانپوری ایک مشاعرے میں غزل پڑھ رہے تھے، حضرت جوشؔ ملیح
آبادی اور مہندر سنگھ بیدی بھی اس محفل میں موجود تھے۔ بسمل صاحب کا ایک شعر
جوشؔ صاحب کو بہت پسند آیا، تو انہوں نے کہا۔ " بھئی تم نے بہت اچھا شعر کہا ہے،
اب بہت مذاق ہو چکا، یہ داڑھی اُتار کر رکھ دو۔"
بسمل نے جواب دیا۔ "مَیں اسے اُتار دوں بشرطیکہ آپ لگا لیں۔"

کنور صاحب نے فرمایا "ان کو دے کر بھی آپ کے پاس بہت بچ رہے گی۔"

کنور صاحب ایک مشاعرے میں شاعروں کا تعارف کروا رہے تھے، جب مولانا انور صابری کے پڑھنے کا نمبر آیا تو کنور صاحب نے فرمایا۔

"حضرات! آپ نے بازو بند، کمر بند وغیرہ کا نام تو سُنا ہوگا۔ مگر یہ دیو بند کا شاعر ہے، جو آپ کے سامنے کلام سُنانے آرہا ہے۔"

ہندوستان کے سابق ہوم منسٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ انور صابری جب سٹیج پر آئے تو کلام پڑھنے سے پہلے فرمانے لگے۔

"وقت وقت کی بات ہے، میں اب تک وہی شاعر کا شاعر ہوں اور کاٹجو صاحب وزیر بن گئے ہیں، حالانکہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہم دونوں ایک ہی جیل میں رہ چکے ہیں۔" کنور صاحب نے فوراً جملہ چسپت کیا۔ "لیکن جرائم جُدا جُدا تھے۔"

کنور صاحب جن دنوں دِلّی کے سٹی مجسٹریٹ تھے، ان کی عدالت میں چوری کے جرم میں گرفتار کئے گئے، ایک نوجوان کو پیش کیا گیا۔ کنور صاحب نے نوجوان کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ملزم کو ذاتی طور پر جانتا ہوں، ہتھکڑیاں کھول دو، یہ بے چارا تو ایک شاعر ہے، شعر چرانے کے علاوہ کوئی اور چوری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔"

جوش ملیح آبادی نے پنجابی زبان کے اکھڑپن سے زچ ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہا "کنور صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ دوزخ کی سرکاری زبان پنجابی ہوگی"۔
کنور صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "تو پھر جوش صاحب! آپکو ضرور سکھ لینی چاہیئے"

کسی مشاعرہ میں کوثر قریشی اپنی غزل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

شرکت انجمن ناز ضروری ہے مگر
ہم پس سایۂ دیوار بہت اچھے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی نے یہ شعر سنا تو کہنے لگے "بہت اچھی بات ہے کوثر صاحب! یہ خیال رکھیئے گا کہ وہ دیوار کہیں نئی دہلی کے ٹھیکے داروں کی بنائی ہوئی نہ ہو کیونکہ ایسی دیواریں بالعموم چار مہینے کے بعد گر جاتی ہیں"

ایک بار یش مولانا قسم کے شاعر کسی مشاعرے میں کہہ رہے تھے۔
"جوش ایسے ملحد اور بیدین اور بے اصول آدمی کا ہندوستان سے پاکستان چلے جانا ہی بہتر تھا۔ خس کم جہاں پاک"
کسی دوسرے شاعر نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔
"جوش صاحب کے مستقل طور پر پاکستان چلے جانے سے تو یہاں خس کی کمی واقع ہو گئی لیکن مولانا اگر آپ پاکستان ہجرت فرما جائیں تو ہندوستان میں کیا چیز کم ہو جائیگی؟"
"خاشاک"
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے دونوں کی گفتگو سننے کے بعد نہایت برجستگی کے ساتھ کہا۔

اسرار الحق مجاز

ایک مشہور شاعر نے مجاز سے پوچھا۔
" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا "
مجاز نے پریشان سا ہو کر جواب دیا۔
" اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ برابر شعر کیوں کہے جا رہے ہیں "

عالمِ مدہوشی میں ایک صاحبِ ذوق خاتون کو اپنی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے مجاز نے کہا " میں ڈکشن کا ماسٹر ہوں "
" تو پھر جوشؔ ملیح آبادی کیا ہیں ؟ " اس خاتون نے محض دل لگی کی خاطر سوال کیا۔
" ڈکشنری کے ماسٹر ! " مجاز نے جواب دیا۔

مجاز سے کسی نے کہا " حکومت ادیبوں کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنا رہی ہے "
مجاز نے فکرمند ہو کر پوچھا " ڈسٹرکٹ جیل میں یا سنٹرل جیل میں ؟ "

کسی فلمی ادیب نے مہا کوی این ڈی مدھوک سے مجاز کا تعارف کراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

" آپ سے ملئے! آپ ہیں اسرار الحق مجاز، اُردو کے بہت مشہور اور مقبول شاعر، وہ نظم " اے غمِ دل کیا کروں" انھی کی لکھی ہوتی ہے۔

مجاز نے مدھوک سے مخاطب ہو کر بہت سادگی سے کہا۔

" صاحب! آپ مطلقاً ان کی بات کا اعتبار نہ کیجئے، شاعر تو آپ ہی ہیں خاکسار تو اُلّو کا پٹھا ہے "

ہندو مسلم اتحاد پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا، دوسرے شاعروں کے ساتھ جب مجاز مشاعرہ گاہ میں داخل ہونے لگا تو اس نے دیکھا وہاں دروازہ پر لکھا ہوا تھا۔

" مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے "

مجاز نے ایک لمحہ کے لئے اس عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد کہا۔

" اور حماقت کے نام پر لڑنا مذہب ہے "

سلام مچھلی شہری نے بہت جذباتی ہوتے ہوئے اُداس لہجے میں مجاز سے کہا۔

" میں متواتر کئی سالوں سے شعر کہہ رہا ہوں اور یقیناً کئی مشہور شاعروں سے اچھے شعر کہے ہیں اُردو شاعری میں بے شمار تجربے کر چکا ہوں میرے متعدد منظوم شاہکار اُردو ادب میں ایک تاریخی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب یہ نقاد حضرات اُردو شاعروں کا جائزہ لیتے ہیں تو مجھے نظر انداز کر دیتے ہیں "

" تم کوئی غم نہ کرو ڈیر سلام! " مجاز نے اُسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

" تمہاری ایک ایک نظم دنیا بھر کی متمدن زبانوں مثلاً روسی چینی جاپانی

انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ترجمہ کی جائے گی اور پھر ——"

" اور پھر ؟ ——"

" اور پھر —— " مجاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔" اور پھر میں ان زبانوں سے تمہاری نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کروں گا —— اور پھر یہ دنیائے ادب اور یہ تمام نقاد تمہاری صحیح مرتبے اور تمہاری عظمت کو تسلیم کریں گے "

جوش ملیح آبادی بالعموم شراب پیتے وقت ٹائم پیس سامنے رکھ لیتے ہیں اور ہر پندرہ منٹ بعد نیا پیگ بناتے ہیں لیکن یہ پابندی بھی اکثر اوقات تیسرے چوتھے پیگ کی نذر ہو جاتی ہے۔

ایک صحبت میں انہوں نے پیگ پینے کے بعد ٹائم پیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز سے کہا " دیکھو مجاز! میں کتنی باقاعدگی سے پیتا ہوں اگر تم بھی گھڑی سامنے رکھ کر پیا کرو تو بداحتیاطی سے محفوظ رہو "

اور مجاز اسی وقت چہکتے ہوئے بولا۔

" گھڑی تو کیا جوش صاحب! میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں "

ایک بار کسی ادیب نے مجاز سے کہا۔

" مجاز صاحب! ادھر آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کر دیئے ہیں "

" تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ؟ "

اور وہ ادیب مجاز کے اس جواباً سوال پر گھبراتے ہوئے کہنے لگے۔

" اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب کسی مشاعرہ میں آپ شعر سنانے کے لئے کھڑے ہوں گے تو لوگ کہیں گے، شعر نہیں اپنے لطیفے سنائیے "
" تو میں ان سے کہوں گا " مجاز نے صفائی پیش کرتے ہوئے سادگی سے کہا کہ۔
" شاعری بھی تو فنونِ لطیفہ میں سے ہے "

جن دنوں مجاز صاحب آل انڈیا ریڈیو کے متوسلین میں سے تھے ایک بار احتشام حسین کو ریڈیو سٹیشن لکھنؤ کی بلڈنگ میں ملے تو انہوں نے مجاز سے پوچھا۔
" اے مجاز! تم یہاں کیسے ؟ "
مجاز نے رونی صورت بنا کر جواب دیا۔
" جی! یونہی بس آرٹ فار آرٹ سیک کبھی کبھار ادھر آنکلتا ہوں "

جوش، فراق اور مجاز تینوں کہیں ہم پیالہ تھے۔
جوش نے تیسرا پیگ پینے کے بعد اپنے مخصوص افغانی جلال میں آتے ہوئے کہا۔
" ماشاء اللہ ہم ابھی تک جوان ہیں، ہماری عمر پچیس تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ کیوں فراق ؟ "
" بے شک "
فراق نے پُر زور تائید کرتے ہوئے کہا۔
" ظاہری شباہت سے قطع نظر میں بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوں " ——— " جی ہاں، جی ہاں ——"

جوش نے مسکراتی ہوئی نظروں سے فراقؔ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔
" اور اس حساب سے ــــ " مجاز نہایت معصومیت سے جوش اور فراق کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔" اور اس حساب سے تو میں ابھی پیدا ہی نہیں ہُوا "

ریاست ٹونک میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔
مقامی شعراء کو پڑھواتے وقت منتظم کو ہر بار یہی اعلان کرنا پڑتا تھا کہ اب فلاں ٹونکوی صاحب اور اب فلاں ٹونکوی صاحب اپنے کلامِ بلاغت نظام سے آپ کو محظوظ فرمائیں گے۔
مجاز نے کچھ دیر تک برداشت کرنے کے بعد جھنجھلا کے کہا۔
" یہ مشاعرہ ہے، یا ٹونسکی ؟ "

فیضؔ صاحب نے جب ایلیس سے شادی کی تو ایک روز انھوں نے ازراہِ مذاق کہا " یار مجاز! میری شادی ہوگئی، لیکن تم نے میرے لئے کوئی سہرا وہرا تو لکھا ہی نہیں "ــــ " کیونکر لکھتا پیارے؟ " مجاز نے جواب دیا۔
" فیضؔ کا لے دے کے ایک ہی تو قافیہ (حیض) ہے، اور وہ بھی تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کس قدر ناپاک ہے "

ایک مشاعرے میں دعوتِ خورد و نوش کا اہتمام تھا، دیگر شعراء تو کھانے سے فارغ ہو کر پنڈال میں پہنچ رہے تھے لیکن مجاز اور جذبی ابھی مصروف تھے منتظمین

میں سے ایک نے آکر جذبی صاحب سے چلنے کی درخواست کی۔
جذبی نے کہا "مجاز بھی چلتا ہوں ذرا سا رائتہ کھالوں"
اور مجاز اتنی سی بات سنتے ہی ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔
"جذبی! اس رائتہ کے مضمون کو اقبال اپنے ہاں یوں نظم کرتا ہے۔ ع
حیف شاہین رائتہ پینے لگا!
اور اختر شیرانی کا مصرعہ ہوتا۔ ع
رائتہ جو رُخِ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے
اور جوش یوں کہتے ع
رائتہ کھا کر وہ شاہِ کج کلاہاں آگیا
اور فراق بیانداز اختیار کرتے ع
ٹپک رہا ہے دھندلکوں سے رائتہ کم کم
اور فیض احمد فیض لکھتا ہے
تیری انگشت حنائی میں اگر رائتہ آئے
اُن گنت ذائقہ کے یلغار کریں مثلِ رقیب
اور میں خود یوں نظم کرتا ہے
بنتِ شب دیگ جنوں رائتہ کی جاتی ہو
میری مغموم جوانی کی توانائی ہو
اور تمہیں تو واقعی یہی کہنا چاہیئے تھا۔ ع
ابھی چلتا ہوں ذرا رائتہ کھالوں تو چلوں

اثر لکھنوی جنہوں نے مجاز کے بارے میں کہا ہے کہ۔
" مجاز اُردو شاعری کا کیٹس تھا جسے ترقی پسند بھیڑیئے اُٹھا کر لے گئے"
ان کے متعلق مجاز سے کسی نے پوچھا۔" آپ کی اثر لکھنوی کے بارے میں کیا رائے ہے، مجاز بھائی؟"
مجاز نے خوفزدہ سے لہجے میں جواب دیا۔
" ایک ایٹم بم تھا جو ہیروشیما پر گرا تھا، اور دوسرے اثر لکھنوی ہیں۔ جو ہماشما پر گرتے ہیں۔"

مجاز اپنی نیم دیوانگی کی حالت میں ایک بار کسی مجلس وعظ میں پہنچ گئے،
اُن کے کسی جاننے والے نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔
" حضرت مجاز! آپ اور یہاں؟"
" جی ہاں ۔۔۔" مجاز نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔
" آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے بھائی؟"

ایک مشاعرے میں مجاز جب اپنا نیم بیہوشی کے عالم میں بھی اپنی نظم ۔۔
بول اری او دھرتی بول راج سنگھاسن ڈانواں ڈول
بڑی کامیابی کے ساتھ پڑھ چکے تو ہنس راج رہبر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔
" مجاز بھائی! کیا یہ نظم تم نے شراب پی کر کہی تھی ۔۔۔؟"
" بلکہ کہنے کے بعد بھی پی تھی ۔۔۔" مجاز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

راجہ صاحب محمود آباد نے بہت پیار سے مجاز سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔
"مجاز اگر تم مان لو تو ایک بات کہوں؟"
مجاز سراپا انکسار بنتے ہوئے بولا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر فرمائیے۔
راجہ صاحب کیا ارشاد ہے؟"
"میں چاہتا ہوں تمہارے لئے دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دوں؟"
"بڑا کرم ہے حضور کا ——"
مجاز نے پھر اسی منکسرانہ لہجے میں جواب دیا۔
"لیکن! ——" راجہ صاحب قدرے سنجیدگی سے بولے۔
"لیکن تم خدا کے لئے شراب پینا چھوڑ دو؟"
"شراب پینا چھوڑ دوں —— ؟" مجاز نے نہایت حیرانی اور بیچارگی سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"پھر آپ کے دو سو روپے ہر ماہ میرے کس کام آیا کریں گے؟"

جگر مراد آبادی نے نہایت ہمدردانہ انداز میں شراب کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے مجاز سے کہا۔
"مجاز! شراب واقعی خانہ خراب ہے' خُم کے خُم لُنڈھانے کے بعد انجام کار مجھے توبہ ہی کرنی پڑی' میں تو دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم بھی میری طرح توبہ کر سکو؟"
"مجاز یہ سُن کر نہایت معصومیت سے کہنے لگا۔

جگرؔ صاحب: آپ نے تو ایک بار توبہ کی، لیکن میں سینکڑوں بار توبہ کر چکا ہوں۔"

مجازؔ کافی ہاؤس میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب جو اُن سے رُوشناس نہیں تھے اُن کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے، کافی کا آرڈر دے کر انہوں نے اپنی کن سری آواز میں گنگنانا شروع کیا ؎

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

مجازؔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

" ڈھونڈنے کی نوبت بھی کہاں آتی ہے حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں؟"

کسی جلسہ میں مرادؔ جعفری اقبالؔ کی شاعری پر تقریر کر رہے تھے، دورانِ تقریر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ اقبالؔ دراصل اشتراکی نقطۂ نظر کے شاعر تھے تو مجمع میں سے کوئی "مردِ مومن" گلا پھاڑتے ہوئے بولا۔

"جعفری صاحب! آپ یہ کیا کفر فرما رہے ہیں، شاعرِ مشرق اور اشتراکیت ؟ ——— لاحول ولاقوۃ آپ اپنی خرافات سے اقبالؔ کی روح کو تکلیف پہنچا رہے ہیں" ——— اور جلسہ کی پچھلی صفوں سے مجازؔ ایک پھلجھڑی کی طرح چھوٹتے ہوئے بولے ——— " حضرت! تکلیف تو درحقیقت آپ کی اپنی روح کو پہنچ رہی ہے، جسے آپ غلطی سے اقبالؔ کی سمجھ رہے ہیں "

مجازؔ جب رانچی کے شفاخانے سے کچھ ماہ بعد لوٹے تو کسی نے پوچھا۔

"مجازؔ صاحب! کیا واقعی آپ کی عقل زائل ہو گئی تھی؟"

مجازؔ نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"برادر! عقل تھی ہی کہاں؟ جو زائل ہوتی عقل ہوتی تو اس ملک میں شاعری کرتے؟"

ایک مشاعرے کے اختتام پر جب ساغرؔ نظامی کو اصل طے شدہ معاوضے سے کم رقم دی گئی اور اس کی رسید اس کے سامنے کی گئی تو وہ اسے دیکھتے ہی ایک دم پھٹ پڑے۔ "میں اس رسید پر دستخط نہیں کر سکتا۔"

اتنے میں مجازؔ وہاں آ گئے، انہوں نے یہ جملہ سُنا تو نہایت معصومیت سے منتظم کو مشورہ دینے لگے۔

"اگر دستخط نہیں کر سکتے تو ساغرؔ صاحب سے انگوٹھا ہی لگوا لیجئے۔"

فراقؔ گورکھپوری اپنی رباعیوں کا موازنہ دوسرے شاعروں سے کرتے ہوئے کہہ رہے تھے

"کہنے کو تو رباعیاں جوشؔ صاحب بھی کہتے ہیں لیکن وہ اس صنف سخن کا باقاعدہ فن کی حیثیت سے استعمال نہیں کرتے، دراصل وہ اپنی شاعری منہ کا مزا بدلنے کیلئے دوسری چیزیں لکھتے لکھتے کبھی کبھی رُباعیاں بھی لکھ دیتے ہیں اُن کی رباعیاں ایک لحاظ سے "چٹنی" ہیں اور میری رباعیاں ——"

"مجازؔ نے فراقؔ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔" ایک طرح سے مربّہ۔"

لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے جب جوش ملیح آبادی کار لیکر وہاں پہنچے تو مشاعرہ گاہ کے گیٹ ہی پر مجاز خیر مقدم کے لئے موجود تھا۔

جوش صاحب کار سے نکلے تو مجاز نے نہایت نیازمندی سے مصافحہ کیا اس کے بعد عرش ملسیانی بھی اُسی کار سے باہر آئے تو مجاز بولا۔

"آہا ہا، عرش بھی؟"

اتنے میں مولانا بسمل شاہجہانپوری نے بھی اپنا بھاری بھرکم اور باریش و بروت چہرہ کار کی کھڑکی سے باہر نکالا تو مجاز نے کھلکھلاتے ہوئے ہی سانس میں جملہ مکمل کر دیا ——— "اور معلّیٰ بھی!" ———

ایک بار ایک انتہائی شوخی اور طرّاری سے اپنا کلام پڑھنے والے شاعر کے ڈائس پر گر پڑے، تو مجاز نے یہ منظر دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔

"سنیئے حضرات! قبلہ اُستاد صاحب خالص زبان کا شعر ارشاد فرمارہے ہیں۔"

حیدرآباد دکن کے لوگ "قاف" کو "خ" بولتے ہیں کسی حیدرآبادی نے مجاز کو ایک دعوت پر مدعو کرتے ہوئے کہا۔

"مجاز صاحب! کل میری فلاں عزیزہ کی تخریب (تقریب) ہے، غریب خانہ پر تشریف لائیے۔" ——— مجاز نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔

"نہیں صاحب! مجھ سے یہ دردناک منظر نہیں دیکھا جائے گا۔"

کسی مشاعرے میں جب مجازؔ غزل سُنا رہے تھے تو اچانک سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں شیر خوار بچّہ زور زور سے چِلّانے لگا۔

مجازؔ اپنی غزل کا شعر ادھورا چھوڑتے ہوئے حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ ع

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟"

کسی مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر غزل پڑھ رہے تھے جس کی زمین تھی "نظاروں سے کھیلا" "بہاروں سے کھیلا" وغیرہ وغیرہ۔

غزل سننے کے بعد مجازؔ نے کہا۔

"ویل پلیڈ (WELL PLAYED) مسٹر!

مجازؔ اور فراقؔ کے درمیان کافی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی، ایک دم فراقؔ کا لہجہ بدلا اور انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مجازؔ! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیئے؟"

"آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا؟"

مجازؔ نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔

اُردو کے ایک نامور اور کہنہ مشق شاعر نے پریشان ہو کر کہا۔

"مجھے اَب شادی کر لینی چاہیئے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ — کر لیجئے۔" مجازؔ نے مشورہ دیا۔

" لیکن بات یہ ہے کہ میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں "
" آپ کسی سے بھی شادی کر لیجئے۔ " مجازؔ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا " ـــــ بیوہ تو وہ بیچاری ہو ہی جائے گی "

جوشؔ نے مجازؔ سے پوچھا۔
" مجازؔ! کیا تمہارے والدین تمہاری رندانہ بد اعتدالیوں سے پریشان نہیں ہوتے؟
" لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے جوشؔ صاحب ـــــ "
مجازؔ نے جواب دیا ـــــ لیکن خوش قسمتی سے میرے والدین مجید سعادت مند ہیں "

کانپور میں سرکاری طور پر شراب نوشی کی ممانعت تھی کسی نے مجازؔ کو بتایا۔
" اس برسات میں کانپور میں فلڈ (سیلاب) آنے کا بہت خطرہ ہے "
مجازؔ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا ـــــ " اور ڈرائی (خشک) کردو "

ایک دعوت میں جب صاحب خانہ کا کمسن بچہ مسلسل کئی منٹوں تک مجازؔ کو گھورنے کے بعد گنگنانے لگا تو کسی نے مجازؔ سے کہا۔
" مجازؔ صاحب! یہ بچہ بڑا ہو کر یا تو شاعر بنے گا یا ـــــ "
اور مجازؔ صاحب نے گرہ لگاتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔
" یا سردار جعفری "

مسعود اختر جمال اور مجاز گورکھپور کے اُردو بازار سے گذر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک دکان کے شوکیس میں رکھے ہوئے بہت بڑے اور بھیانک قسم کے جوتے پر پڑی، جمال نے مجاز سے پوچھا۔

" مجاز! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کا دوسرا جوتا کہاں ہے؟"

" مجاز نے اپنی مخمور نگاہوں سے جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اللہ میاں نے دُنیا والوں کی عبرت کے لئے ایک جوتا تو یہاں بھیج دیا ہے اور دوسرا عاقبت میں بھیگ رہا ہے، جو تمہیں انشاء اللہ قیامت کے دن نظر آئے گا۔"

سعادت حسن منٹو

منٹو کی بذلہ سنجی اور ظرافت کے سینکڑوں واقعات زبان زدِعام ہیں، جب منٹو کے افسانہ "بو" پر کچھ "بااخلاق" لوگ بدک اُٹھے اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا تو ایک ادیب نے منٹو سے کہا۔

" لاہور کے کچھ سرکردہ بھنگیوں نے اربابِ عدالت سے شکایت کی ہے کہ آپ نے ایک افسانہ "بو" لکھا ہے جس کی "بدبو" دُور دُور تک پھیل گئی ہے۔"

منٹو نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" کوئی بات نہیں، میں ایک افسانہ "فینائل" لکھ کر ان کی شکایت رفع کر دوں گا۔"

منٹو صاحب سے جب احمد ندیم قاسمی کا کیریکٹر سکیچ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو وہ اُداس ہوکر نہایت بجھے بجھے لہجہ میں کہنے لگے۔

" قاسمی کا سکیچ —— وہ بھی کوئی آدمی ہے، جتنے صفحے چاہو سیاہ کر والو لیکن بار بار مجھے یہی جملہ لکھنا پڑے گا ——

" قاسمی بہت شریف آدمی ہے۔"

اسی طرح ایک بار عبدالمجید بھٹی احمد ندیم قاسمی کے مکان پر انہیں اپنے نئے ناول کا مسودہ سُنا رہے تھے کہ اتنے میں وہاں منٹو صاحب آگئے اور آتے ہی

انہوں نے بلند آواز کے ساتھ قاسمی صاحب سے کچھ پیسے مانگے' بھٹی صاحب نے منٹو کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے نہایت انکسار سے کہا۔

" منٹو صاحب! میں نے ایک ناول لکھا ہے' قاسمی صاحب کو سُنا رہا ہوں۔ بیٹھئے! آپ بھی سُنئے؟"

منٹو نے کھڑے کھڑے تلملاتے ہوئے جواب دیا۔

" لاحول ولا۔ میں اور تمہارا ناول سُنوں' تم بھی عجیب ہونق انسان ہو کیا مجھے بھی قاسمی کی طرح کوئی بزدل اور شریف آدمی سمجھ لیا ہے؟"

منٹو جب کچھ روز پاگل خانہ میں رہ کر آئے تو یار دوست مزاج پرسی کیلئے اُن کے ہاں آئے' منٹو نے بہت حسرت سے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" بھائیو! چھوٹے پاگل خانہ سے نکل کر بڑے پاگل خانہ میں آ گیا ہوں"

جگر مراد آبادی لاہور تشریف لائے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے کیلئے اُنکی قیام گاہ تک پہنچے' جگر نہایت اخلاص او ر تپاک سے ہر ایک کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ اتنے میں سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

" قبلہ! اگر آپ مراد آباد کے جگر ہیں' تو یہ خاکسار لاہور کا گُردہ ہے"

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے

نقے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لحہ بھر کیلئے رُک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمکیلی سی لہر دوڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے ۔

" راشد صاحب! جناب راشد صاحب! ذرا جلدی سے باہر تشریف لائیے"
شور سُن کر ن،م، راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو سٹیشن کے دوسرے کارکن بھی، ان کے گرد آجمع ہوئے ۔

" راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے؟" منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل! خدا کی قسم سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے ۔"

ایک بار ہوٹل میں بیٹھے ہوئے منٹو صاحب نے مدہوشی کے عالم میں کئی گلاسوں اور پلیٹوں کو توڑ دیا۔ لیکن بیرا بل لیکر آیا تو ان کی آنکھوں میں ذہانت عود کر آئی ۔"

" اس بل میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت کیوں شامل کی گئی ہے ؟"
انہوں نے بیرے سے پوچھا ۔

" صاحب یہاں کا دستور یہی ہے ۔"

" دستور کے بچے! بلاؤ مینجر کو " انہوں نے غراتے ہوئے بیرے کو ڈانٹا اور جب مینجر آیا تو اس سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھنے لگے ۔

" کیوں صاحب! آپ کی بار میں جو گلاس یا پلیٹیں ٹوٹ جائیں ان کی قیمت بھی آپ اپنے گاہکوں ہی سے وصول کرتے ہیں ؟

" جی ہاں! ---- اور اصول بھی یہی ہے" منیجر نے نہایت متانت سے جواب دیا ---- " اچھی بات"

اور یہ کہہ کر منٹو صاحب خاموشی سے بل ادا کر کے چل دیئے۔

تقریباً ایک ہفتے بعد وہ اسی ہوٹل میں پھر سے موجود تھے، ان کے احباب اُس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب وہ ایک دم بہک جائیں گے لیکن وہ تو بہکنے کی بجائے ایک دم چلا اُٹھے۔

" سانپ ---- ارے سانپ!"

ان کی چیخ دیکار حسن کر بار کی جا مد فضا میں کھلبلی کی ایک لہر دوڑ گئی اور پھر سانپ کو دیکھ کر وہ ہنگامہ ہُوا کہ خُدا کی پناہ! سراسیمہ ہو کر بھاگنے والوں نے کرسیاں اور میزیں اوندھی کر دیں اِس اثناء میں کھانے کی کئی پلیٹیں اور گلاس اس افراتفری کی نذر ہو گئے۔

جب سانپ مارا جا چکا اور قدرے سکون ہُوا تو منٹو نے بیرے سے بل طلب کیا اور پھر بل کو دیکھتے ہی منیجر کو بلایا۔ منیجر کے سپاٹ چہرے پر نظر پڑتے ہی اُن کی آنکھوں میں مخصوص ذہانت چمکنے لگی۔

" آج آپ نے بل میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور پلیٹوں کی قیمت شامل کیوں نہیں کی؟"

اور اس سوال پر منیجر نے کچھ اور زیادہ متانت سے جواب دیا۔

" وہ تو سانپ کی وجہ سے ٹوٹی ہیں جناب! اس میں کسٹمروں کا کیا قصور ؟"

" لیکن قبلہ منیجر صاحب! یہ آپ کے اصول کے منافی ہے" اُنہوں نے مُسکراتے ہوئے فقرہ کسا اور پھر بٹوے میں سے کچھ نوٹ نکال کر منیجر کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"لیکن مجھے کوئی فرق نہیں پڑا"
مینجر حیران سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔
اور جب منٹو اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جانے لگے تو انہوں نے مینجر کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
" مینجر صاحب! پچھلی مرتبہ جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی تھیں تو آپ نے کھانے پینے کے اخراجات کے علاوہ کراکری کے تین چار روپے چارج کر لئے تھے اور آج جب آپ کی پلیٹیں ٹوٹی ہیں تو مجھے یہ تین روپے آپ کو ادا کرنے کی بجائے یہاں آنے سے پہلے ایک سپیرے کو دینے پڑے ہیں"
" سپیرے کو . . . . . ؟ ـــــ مینجر نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔
" جی ہاں! جس سانپ کو آپ لوگوں نے مار دیا ہے، میں اسے تین روپوں میں خرید کر یہاں لایا تھا۔"

کسی نے منٹو صاحب سے پوچھا
" منٹو صاحب! پچھلی مرتبہ جب آپ ملے تھے، تو آپ سے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی تھی کہ آپ نے شراب سے توبہ کر لی ہے، ـــــ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج آپ پھر پئے ہوئے ہیں۔"
" بجا ارشاد قبلہ! فرق صرف اتنا ہے کہ اس دن آپ خوش تھے اور آج میں خوش ہوں۔"

کہانی مکمل ہوگئی تو مسودہ جیب میں ڈال کر وہ گھر سے باہر نکلے اور حسبِ عادت

ایک خالی تانگے کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گئے۔

" کہاں جانا ہے صاحب ؟"

" انار کلی !"

اور تانگا چلنے لگا راستے میں عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے ان کی مضطرب آنکھیں ہر راہ چلتے کو دیکھ رہی تھیں دفعتاً ان میں چمک پیدا ہوئی اور تانگہ رکوا دیا گیا۔

ایک پبلشر سے راہ ہی میں ملاقات ہو گئی لیکن اس کے پاس سے پانچ کے نوٹ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آسکا۔

تانگہ پھر سے چلنے لگا اور آخر ایک رسالے کے دفتر کے سامنے جا رُکا۔ انہوں نے اُتر کر پانچ کا نوٹ کوچوان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

" صاحب ریزگاری نہیں ہے" کوچوان نے کہا

" یہ کیا بکواس ہے ؟ خیر میں سامنے دفتر میں جا رہا ہوں باقی پیسے وہیں پہنچا دینا " اتنا کہہ کر وہ لپک کر دفتر میں داخل ہو گئے۔

" آیئے آیئے ! قبلہ منٹو صاحب ! ایک منحنی سے نوجوان نے اُٹھ کر خیر مقدم کیا۔

اور منٹو نے کھٹ سے اپنی جیب سے کہانی کا مسودہ نکالتے ہوئے کہا۔

" لو میری جان ! تمہارے رسالے کے لئے بڑی ہب ٹلا کہانی لکھی ہے لیکن اس کے معاوضے کی مجھے فوراً ضرورت ہے کہاں ہے وہ فراڈ اعظم تمہارا آقائے محترم !

" اس کی کیا پوچھتے ہیں آپ منٹو صاحب ! نوجوان نے تملاتے ہوئے کہنا شروع

کیا۔ "سالا صبح سے غائب ہے، مجھے خود پیسوں کی سخت ضرورت ہے، پچھلے مہینے کی پوری تنخواہ بھی کمبخت نے ابھی تک نہیں دی، بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ پنواڑی تک اب اُدھار دینا بند کر دیا ہے، اس لئے صبح سے بیڑیوں سے کام چلا رہا ہوں، سگریٹ تک کے لئے پیسے نہیں ہیں۔

اس مرتبہ اپنی جھلاہٹ کا مظاہرہ انہوں نے خاموشی سے کیا، چند لمحے کچھ سوچتے رہے اور پھر دوڑ کر باہر نکل آئے، ان کے پیچھے پیچھے ایڈیٹر بھی آگیا۔

باہر تانگہ والے کا نشان تک نہ تھا، دو تین بار زور زور سے آوازیں دینے کے بعد جب منٹو نے دیکھا کہ وہ "مرد ہوشیار" فُودد گیارہ ہو چکا ہے۔ تو وہ کسی انجانی مسرت کے احساس سے مُسکرا دیئے اور ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"تم نے سچ کہا تھا چُغد! واقعی تم بدنصیب آدمی ہو، اور تم جیسے بدنصیبوں کو سگرٹوں کی جگہ بیڑیاں ہی پینی چاہئیں۔

"جی ہاں، جی ہاں" اور اس کے بعد ایک دم اس ایڈیٹر نے چونکتے ہوئے پوچھا ـــــ "کیوں ـــــ وہ کیوں منٹو صاحب؟"

اور منٹو صاحب نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ اپنی تمام پونجی مبلغ پانچ روپے نوٹ کی صورت میں تانگے والے کو دے کر آئے تھے، اور وہ ریزگاری کے بہانے نوٹ ہی پر ہاتھ صاف کر گیا۔

"تو بدنصیب تو آپ ہوئے حضرت ـــــ"

ایڈیٹر کے چہرے کی زردی سے بھی تھکی تھکی مسکراہٹ جھانکنے لگی۔

"عجیب بوگس آدمی ہو، اے میاں! میں نے سوچا تھا کہ تانگہ والا کرایہ کاٹ

کر جو پیسے دے گا وہ تمہیں سگرٹوں کے لئے دیدوں گا' اتنی سی بات نہیں سمجھے ۔
—— بد نصیب نہیں تو اور کیا ہو —— ؟

"دیکھو ! ابھی تمہیں ایک پُر لطف کھیل دکھاتا ہوں"
ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ایک دُبلے پتلے سے نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا' اور پھر دوسرے ہی لمحے اندر آنے والے ایک شخص کو پکارتا ہُوا بولا۔
"آہا ! عاشق صاحب ! آئیے آئیے حضرت ! تشریف لائیے !
کیسے مزاج ہیں ؟ فرمائیے کیا پیجئے گا —— چائے ؟ اے بھائی ایک کپ چائے اور بھیج دینا ۔"
اور کچھ دیر بعد عاشق صاحب ان کے دوستوں میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے' تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ وہی نوجوان اپنے دوستوں سے چہک چہک کر باتیں کرنے لگا'
"یارو ! لاہور کی کیا بات ہے جس نے لاہور نہیں دیکھا واقعی وہ پیدا ہی نہیں ہُوا ۔" اور وہ اپنے مخصوص انداز میں لاہور کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا —— ارے میاں ! اور تو اور' لاہور میں حکومت نے ٹریفک کے سپاہیوں کو اب برف کے کوٹ مہیا کر دیئے ہیں !"
"برف کے کوٹ ——"
عاشق نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا ۔
"جی ہاں ! برف کے کوٹ !! آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں عاشق صاحب ! حضور ! یہ سائنس کا دَور ہے سائنس کا' ریڈیو' ہوائی جہاز' سینما' بجلی کے چولہے

بجلی کی استریاں، بجلی کے پنکھے، ارے بھائی! سائنس کی شعبدہ کاریوں کی کوئی حد ہے؟ ابھی تو برف کے کوٹ ہی بنے ہیں، ذرا آگے آگے دیکھئے۔"

اور عاشق نے مجسم سوال بنتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا دماغ تو تسلیم نہیں کرتا، اے میاں کبھی برف کے کوٹ بھی سل سکتے ہیں، کیسی بے تکی ہانک رہے ہو؟"

"اجی قبلہ و کعبہ عاشق صاحب ۔۔۔۔" وہ نہایت اعتماد اور یقین سے بولنے لگا ۔۔۔۔ "سائنس کے اتنے بڑے تلاطم خیز طوفان کے سامنے آپ کے اس بھولے بھالے اور چھوٹے سے دماغ کی کیا حیثیت ہے؟ آپ فرما رہے ہیں، برف کے کوٹ سل کیونکر سکتے ہیں اور آپ کے سائنسدانوں نے سی کر بھی دکھا دیئے۔

بزرگوار! میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں ایسے کوٹ، لاہور کے چوراہوں پر جگہ جگہ ٹریفک کے سپاہیوں نے بڑے ٹھاٹ سے انہیں پہن رکھا تھا۔"

اور پھر وہ نوجوان عاشق صاحب کے دل و دماغ کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔

دوسرے روز وہ نوجوان حسب معمول اپنے ساتھیوں کے ساتھ امرتسر کے اس ہوٹل میں داخل ہوا تو ایک میز پر سے عاشق صاحب کسی شکرے کی طرح اس پر جھپٹے اور بغیر کچھ کہے سنے اس پر پل پڑے۔

پلک جھپکتے ہی دونوں کی قمیضیں پھٹ چکی تھیں، ایک کے منہ اور دوسرے کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ہوٹل میں اک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے دونوں کو چھڑایا تو عاشق صاحب دانت پیس پیس کر کہنے لگے۔

"اے خدا کی مار تجھ یاوہ گو، لعنتی لفنگے پر، تجھے پالا نہیں پڑا کبھی مجھ جیسے آدمی سے، بیٹا وہ پٹائی کروں گا کہ دماغ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

اور جب ایک صاحب نے عاشق صاحب سے اصل بات دریافت کی تو وہ چیختے ہوئے بولے۔" اجی! اس کم بخت کل کے چھوکرے نے مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے، میں ابھی ابھی لاہور سے آرہا ہوں، قسم قرآن شریف کی، وہاں کسی سپاہی کے جسم پر برف کا کوٹ نہیں تھا، آپ ہی کہیئے، میں کوئی دیوانہ ہوں، پاگل ہوں، سڑی ہوں، سودائی ہوں، جو اس باتونی نے مجھے یوں پریشان کیا ـــــــ"

اور اس نوجوان کے دوستوں میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں عاشق صاحب! آپ تو خدا کے فضل سے نہایت ہوش مند انسان ہیں، خرابی تو اس سعادت حسن منٹو کے دماغ میں ہے، جو ایسی باتیں کرتا ہے۔"

"اجی چھوڑیئے اوپندر ناتھ اشک کی بات، آپ بھی کس دوزخی کا ذکر لے بیٹھے، بجد بخیل ہے بنیا۔ سنئے! خوب یاد آیا۔" اور اس تمہید کے بعد منٹو نے کہنا شروع کیا۔

"کم بخت نے ایک بلی پال رکھی ہے، جی ہاں بلی! صبح سویرے ہی اسے اڑوس پڑوس کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں، اور وہ شطونگڑی بھی کہیں نہ کہیں سے آنکھ بچا کر دودھ پی کر جب واپس آتی ہے تو اشک صاحب اُسے اُلٹا لٹکا کر اسکے پیٹ سے سب دودھ باہر نکال لیتے ہیں اور پھر اُسی دودھ سے چائے بنا کر پیتے ہیں، جی ہاں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں، رتی بھر مبالغہ نہیں، نہیں صاحب! سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے میں خود اُن کے ہاں اس دودھ کی چائے پی چکا ہوں۔"

مجید لاہوری

ایک نوجوان شاعر نے لاہور کے ایک مشاعرے میں حضرت مجید لاہوری سے متعارف ہوتے ہوئے درخواست کی "حضرت اپنا پتا تو دیجئے تاکہ جب کبھی کراچی آنا ہو تو ملاقات سے محروم نہ رہوں"

مجید لاہوری مرحوم بڑی سنجیدگی سے بولے، نوٹ کر لیجئے۔

"ارشاد" شاعر نے اپنی ڈائری کھولی۔

"شاعر نمبر ایک ہزار تین سو چالیس" مجید لاہوری نے جواب دیا۔

تقسیم ملک کے بعد ہند و پاک مشاعرے میں شریک ہونے کیلئے جب مجید لاہوری پہلی بار دلّی گئے تو ان کے شاعر دوستوں نے نہایت گرم جوشی سے اِن کا استقبال کیا۔ ایک حاکم قسم کے شاعر نے پیش کش کی۔

"مجید صاحب! اگر آپ فرمائیں تو کل اپنی گاڑی میں بٹھا کر آپ کو یہاں کا مغل گارڈن دکھلاؤں"

مجید صاحب اس وقت مسرت کے عالم میں تھے، قریب ہی کھڑے ہوئے ایک شاعر مولانا بسمل شاہجہانپوری کے شانے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"تمہارا مغل گارڈن تو میں نے یہیں دیکھ لیا ہے میرے بھائی! اس مولوی کو دیکھو ظالم مغل بھی ہے ......"

اور مولانا کی غیر معمولی طور پر گھنی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی ـــــ" اور ...... گارڈن بھی ......!"

ایک بار دہلی میں پاکستان کے اخبار نویسوں کا استقبال بڑے تپاک سے کیا گیا' وہاں گوپی ناتھ امن نے ایک استقبالیہ نظم پڑھی' جس میں ایک شعر تھا ۔

اسیر دامِ محبت ہیں سارے دل والے ہمارے گھر میں وہی دام لے کے آئے ہیں

اس پر مجید لاہوری نے کہا " نیا جال لائے پرانے شکاری"

جمہوری تقاضوں کی تعریف کرتے ہوئے مجید لاہوری لکھتے ہیں۔

" انگریز کے دَور کو تو ہم خلافِ جمہوریت کہتے تھے اور اس کے ہر عمل کو ظلم و تشدد قرار دیتے تھے' مگر آج کے دَور میں۔

دفعہ ۱۴۴ لگتی ہے ـــــ تو ـــــ جمہوری تقاضوں کیلئے

گولی چلتی ہے ـــــ تو ـــــ جمہوری تقاضوں کیلئے

لاٹھی چارج ہوتا ہے ـــــ تو ـــــ جمہوری تقاضوں کیلئے

سیفٹی ایکٹ لگتا ہے ـــــ تو ـــــ جمہوری تقاضوں کیلئے

مارشل لا، لگتا ہے ـــــ تو ـــــ جمہوری تقاضوں کیلئے

اور دوسری طرف ان تمام اقدامات کی مخالفت اور شہری آزادی کی حمایت ہوتی ہے' تو جمہوری تقاضوں کے لئے' غرضیکہ ہمارا چلنا پھرنا کھانا پینا سونا جاگنا' اُٹھنا' بیٹھنا' اوڑھنا' بچھونا' سب جمہوری تقاضوں کیلئے ہے' دوسری طرف جمہور کی

کیفیت یہ ہے کہ وہ جمہور کم اور "منظور" زیادہ ہے۔

"گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے" مجید لاہوری نے یہ عام جملہ پڑھا تو اپنے کالم میں لکھا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سردیوں میں" اورنج سکوئش" گرمی پہنچاتا ہے؟

مجید لاہوری کو پیشاب میں شکر آتی تھی، ایک روز حاجی لق لق کراچی آئے تو لاہور واپس جاکر انہوں نے "زمیندار" میں لکھا ۔۔

بخت ور ہے مجید لاہوری جس کو گھر بیٹھے "شوگر" آتی ہے

اس کے جواب میں مجید لاہوری نے لکھا۔

"اب جبکہ چینی کا توڑا پڑا تو میں نے پھر" قارورہ" ٹیسٹ کرایا تو معلوم ہوا کہ" شوگر" آنا بند ہوگئی ہے" گویا ان دنوں میری" مردان شوگر فیکٹری" بند ہے۔

اپنے سنیما دیکھنے کے اصول کے بارے میں ایک بار لکھتے ہیں۔

"میں سنیما بہت کم دیکھتا ہوں اور میرا اصول یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک گناہ کرلو۔ مولوی گل شیر خاں نے کہا ہے کہ سنیما دیکھنا گناہ ہے" پیر علی محمد راشدی نے کہا ہے کہ اخلاق بگڑ تا ہے عریاں تصویریں دیکھ کر' خیر میں مانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے' لیکن میرے خیال میں پیسے خرچ کرکے سنیما دیکھنا" گناہ کبیرہ" ہے' ایک تو سنیما دیکھنے کا گناہ' دوسرے اسراف کا گناہ' اسلئے اگر پاس مل جائے تو میں ایک گناہ کرلیتا ہوں' دوسرے گناہ یعنی اسراف

کا مرتکب نہیں ہوتا۔

گیا انگریز لیکن اس کی انگریزی نہیں جاتی' اس سلسلے میں مجید لاہوری لکھتے ہیں۔
"مجھے تو یہ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے' یہ گوری زبان ہی نہیں بلکہ "گوری کا جوبن"
بھی ہے' اگر میرے بس میں ہو یعنی مطلب یہ ہے کہ جیب میں ذرا "ناں واں" ہو تو میں
"انگریزی" سے شادی کر لوں' آخر لوگ دوسری شادی کرتے ہیں اور شرعاً یہ جائز بھی ہے۔
میں تو کہتا ہوں ؎

کیا ہوا رنگ ہے اگر کالا
منہ میں گوری زباں ہے پیارے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

دلّی کے ایک مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی غزل سُنا رہے تھے کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ "واہ حفیظ پیارے! کیا گلا پایا ہے، یار میرا سارا کلام لے لو مگر اپنی آواز مجھے دے دو۔"

حفیظ فوراً شعر ادھورا چھوڑ کر بولے۔

"جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیاز مند ہوں، میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجئے لیکن خدا کے لئے مجھے اپنا کلام نہ دیجئے۔"

ایک مشاعرے میں ساغر نظامی اپنی غزل سُنا رہے تھے، جب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

بہت تلخ تھی زندگانی مگر
گلوں گل رخوں میں بسر ہو گئی

تو حفیظ صاحب نے بے اختیار داد دیتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ! کیا بات ہے بسر ہو گئی سے یہاں مراد ہے "شیریں ہو گئی"۔"

کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنا یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

دُنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

سامعین میں سے کسی من چلے نے کہا۔
" جزاک اللہ، کیا نیشن بلڈنگ (قوم کو سنوارنے کا) پروگرام ہے۔

سر کے بالوں کے سلسلے میں حفیظ صاحب " فارغ البال" ہیں۔
کسی خوش فکر دوست نے کہا۔
" حفیظ صاحب! سر کے بال نہ ہونے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"
" تکلیف کیا ہوتی ہے ——؟
حفیظ صاحب نے جواب دیا " البتہ وضو کرتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منہ کو کہاں تک دھونا ہے "

شاعروں کی ایک محفل میں پنڈت میلارام وفا نے ایک اجنبی نوجوان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا " آپ ہیں نادان صاحب اور مجھ سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے ہیں "
ایک شاعر نے وفا صاحب کے تخلص کی رعایت سے جملہ کسا۔
" کافی وفادار شاگرد معلوم ہوتا ہے "
اس پر حفیظ صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں — کہ ان کا نتیجہ پشیمانیاں ہیں

---

۷۳ ۱۹ء کے ہند پاک مشاعرے میں پاکستان سے گئے ہوئے شاعروں میں سب سے آخر میں جناب حفیظ جالندھری کو اپنا کلام سنانا تھا اُن کے بعد سنا گوپی ناتھ امن

کو بحیثیت صدر پڑھنا تھا لیکن وہ احتراماً حفیظ صاحب سے پہلے پڑھنا چاہتے تھے، اس لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ان سے پہلے حفیظ صاحب بن بلائے ہی سٹیج پر پہنچ گئے۔ امن نے کہا "پہلے میں پڑھوں گا" حفیظ صاحب نے جواب دیا" یہ خلاف ضابطہ ہے، پہلے میں پڑھوں گا" اور یہ کہہ کر انہوں نے پرچہ جیب سے نکال لیا۔ اُدھر امن صاحب نے بھی پرچہ نکال لیا اور سامعین سے مخاطب ہو کر کہا۔

حضرات! اَب دو گانا ہوگا"

حفیظ صاحب یہ سُن کر مسکرائے اور پرچہ جیب میں رکھ کر کہنے لگے

"بھائی میں ہار گیا۔"

حفیظ جالندھری پہلی بار حج کرنے کے بعد واپس آئے تو اُن کے چہرے پر ریش دراز کا اضافہ ہو چکا تھا۔ کسی مشاعرہ میں ان کا یہ حلیہ دیکھ کر ساحر لدھیانوی نے داڑھی کی طرف اشارہ کرتے پوچھا،

"کیوں خان صاحب! یہ شاہنامۂ اسلام کا تازہ ایڈیشن ہے؟"

کنہیّا لال کپور

ایک انگریز خاتون جو خاصا ادبی ذوق رکھتی تھیں کنہیا لال کپور سے متعارف ہوئیں تو اُن کے نحیف و نزار جسم کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

"کپور صاحب! آپ تو سوئی کی طرح پتلے ہیں"

کپور نے مسکراتے ہوئے نہایت انکساری سے کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی محترمہ! بعض سوئیاں مجھ سے بھی موٹی ہوتی ہیں"

کنہیّا لال کپور نے کسی شخص پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا"

"میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا"

اس شخص نے بھی برہمی میں بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"تو آپ ٹھیک سمجھے غلط فہمی مجھی کو ہوئی"

کپور نے نہایت سنجیدگی اور کمالِ عجز سے اعتراف کر لیا۔

ایک بار آپ کسی ادبی اور معیاری قسم کے اُردو ماہنامہ کے ایڈیٹر سے ملنے کے لئے اس کے دفتر میں تشریف لے گئے۔

باتوں باتوں میں اپنے ایڈیٹر دوست سے دریافت کیا۔

"آپ کا پرچہ ہر ماہ کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے؟"

"گیارہ سو ——"

"گیارہ سو؟ —— وہ کیوں؟ ——" کپور نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک ہزار مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لئے اور ایک سو اعزازی طور پر ادیبوں کو مفت بھیجنے کے لئے۔"

کپور نے انتہائی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"تو جناب آپ صرف ایک سو پرچہ ہی شائع کیا کیجئے۔"

کلکتے کے ایک بنگالی پروفیسر سے کنہیالال کپور کا تعارف کرایا گیا تو اس نے کپور کے دُبلے پتلے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ پنجابی ہرگز معلوم نہیں ہوتے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں" کپور نے جواب دیا۔

"پنجابی کے بجائے بنگالی نظر آتا ہوں۔"

"نہیں صاحب بنگالی سے بھی بدتر۔"

"معاف کیجئے گا' بنگالی سے تو شاید ہی کوئی بدتر ہوگا۔"

متفرق

ایک روز سر ضیاء الدین بارش سے بھیگتے ہوئے گھر پہنچے کپڑے جلدی جلدی اُتار دینے کی نیت سے ہیٹ کو بارش پھینک دیا اور سگار کو کھونٹی پر لٹکانے کی کوشش کرنے لگے ـــــ اسی طرح ایک روز تھکے ہوئے باہر سے آئے ان کا خیال یہ تھا کہ گھر پہنچتے ہی چھڑی کو کونے میں رکھکر خود اسی بستر پر لیٹ جاؤنگا اور جب ذرا تکان دُور ہو گی تو کپڑے بدل لونگا مگر جب گھر پہنچے تو عالم بدحواسی میں چھڑی کو بستر پر لٹا دیا اور خود چُپ چاپ کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

سر ضیاء الدین اور مولانا عبدالمجید سالک ایک دوسرے کو جانتے تھے' آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے موقع پر سر سکندر کے ہاں، ان کی ملاقات ہو گئی' مولانا سالک نے اُن سے از راہِ شوق مصافحہ کرتے ہوئے عرض کی،

"فرمایئے ڈاکٹر صاحب قبلہ! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

"فرمایا' ہاں خدا کا شکر ہے' مگر حضرت آپ نے جب سے سکرٹریٹ کی نوکری چھوڑی ہے' کہیں نظر ہی نہیں آتے؟"

مولانا بہت حیران ہوئے آخر عرض کی" قبلہ میرا نام عبدالمجید سالک ہے اور میں" انقلاب" اخبار کا ایڈیٹر ہوں' شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا" نہیں نہیں! میں نے آپ کو

اچھی طرح پہچان لیا ہے جبھی تو کہتا ہوں کہ جب سے آپ نے سکرٹری کی نوکری چھوڑی ہے کہیں نظر نہیں آئے "

مولانا ابھی حیران و پریشان ہی ہو رہے تھے کہ خان بہادر شیخ معزالدین ڈپٹی ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے جو ڈاکٹر صاحب کے شاگرد بھی تھے، ادھر آنکلے، انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کھڑے دیکھا تو لپکے اور بڑے شوق سے مصافحہ کرنے کے بعد بولے "میرا نام معزالدین شیخ ہے، آپ نے پہچان لیا مجھے ؟"

ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "ہاں ہاں پہچان لیا، فرمائیے وہ آپکا لیکچر ہو گیا"

اب شیخ صاحب حیران تھے کہ کونسا لیکچر ؟ انہوں نے دوبارہ گذارش کی۔

"قبلہ میں معزالدین شیخ ہوں، آپ کا پرانا شاگرد، ریلوائی آدمی ہوں، مجھے لیکچر سے کیا سروکار !"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ہاں ہاں بھئی ! میں جانتا ہوں، میں نے پروگرام میں تمہارا نام پڑھا تھا اسی لئے تو پوچھتا ہوں کہ تمہارا لیکچر ہو گیا ہے ؟"

اب بیچارے شیخ صاحب بھی خاموش تھے۔

سر ضیاءالدین ایک روز دفتر میں بیٹھے تھے کہ اُن کا داماد جس کی ان کی دختر بلند اختر سے چند روز ہوئے شادی ہوئی تھی، اُن سے ملنے آیا جب وہ اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اسے دیکھا اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر کام میں مشغول ہو گئے، کافی دیر تک کاغذات لٹتے پلٹتے رہے اور فارغ ہوئے تو اپنے ہی داماد سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"ویل جنٹلمین ! وٹ کین آئی ڈو فار یو ؟"

داماد بیچارا یہ سُن کر ہکّا بکّا رہ گیا' ایک واقف کلرک کہیں پاس ہی بیٹھا تھا اس نے گذارش کی کہ "حضرت! یہ تو آپ کے داماد صاحبزادہ ..... ہیں"
تب آپ کو ہوش آیا اور کہنے لگے۔" ہاں ہاں خوب یاد دلایا۔"

میرا جی اپنے چند احباب کے ساتھ بازار میں گھوم رہے تھے' چلتے چلتے اچانک انہوں نے اپنے ساتھیوں کو احساس دلایا کہ دیواروں پر جگہ جگہ مصرعے لکھے ہوئے ہیں' جیسے۔

ع خالص دیسی گھی کی دوکان۔
ع بیمار سائیکلوں کا ہسپتال یہی ہے۔
ع اس جگہ پیشاب کرنا منع ہے۔
ع اپنے جگر کے فعل کو بیدار کیجئے۔

راستہ میں ایک ٹی سٹال کے دروازے پر چائے کا ایک خوشنما کیلنڈر آویزاں تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

" گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے "

میرا جی نے کیلنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
" دیکھئے! یہاں بھی ایک مکمل مصرع تحریر ہے "
" کیسے' وہ کیسے ؟ ـــــــ " سب نے حیران ہو کر پوچھا
" یُوں پڑھیئے نا اسے" میرا جی نے اپنی روایتی ساحرانہ متانت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ع " گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈ پہنچاتی ہے ڈک "

قتیل شفائی نے ایم اسلم سے اپنی اوّلیں ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہا۔
" کتنی عجیب بات ہے کہ میں اسلم صاحب کی کوٹھی میں اُن سے ملنے گیا لیکن اسکے باوجود اُن کا تازہ افسانہ سننے سے بال بال بچ گیا۔"

" یہ ناممکن ہے۔"

کسی نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

" سُنئے تو! ——"

قتیل نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

" ہُوا یوں کہ انتہائی خاطر و مدارات کے بعد جب اسلم صاحب اپنا نیا افسانہ سُنانے کے موُڈ میں آنے لگے تو انہوں نے کہا " قتیل صاحب! آپ کی کچھ نظمیں اِدھر میری نظر سے گذری ہیں آپ تو خاصے معقول شاعر ہیں مگر نہ جانے عام لوگ ہر ترقی پسند شاعر کے بارے میں کیوں بدگمانی کا شکار ہیں " اور اسلم صاحب کی اس بات کے جواب میں میں نے نہایت انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

" جی ہاں! واقعی عام لوگ بہت غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں دیکھئے نا! اب آپ کے بارے میں بھی یوں تو یہی بات مشہور ہے کہ آپ ہر نووارد مہمان کی تواضع کرنے کے بعد اپنا کوئی نیا افسانہ ضرور سُناتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔"

جب "لحاف" کے سلسلے میں عصمت چغتائی پر مقدمہ دائر ہو گیا اور اسے اپنے شوہر کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کے لئے بمبئی سے لاہور آنا پڑا تو لاہور میں دونوں نے اتفاق سے میاں ایم اسلم کے ہاں قیام کیا۔

میاں صاحب نے حسبِ عادت نہایت خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا لیکن رات کو کھانے کے بعد عصمت سے انتہائی مشفقانہ لہجے میں کہنے لگے۔

" تمہیں علم ہے عصمت! تمہارے بھائی عظیم بیگ جب لاہور میں آتے تھے تو میرے ہی ہاں ٹھہرتے تھے۔ میرے ساتھ ان کے برادرانہ مراسم تھے، اس رشتہ سے میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتا ہوں۔

اس ابتداء کے بعد انہوں نے بزرگانہ متانت سے عصمت کو سمجھانا شروع کیا۔

" شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو ایسی کہانیاں نہیں لکھنی چاہئیں کہ عدالتوں کچہریوں تک پہنچنے کی نوبت آئے، اب تم خود ہی سوچو کہ ایک بھائی کے لئے کتنی شرم کی بات ہے کہ اس کی بہن ـــــــ"

عصمت نے فوراً بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

" بھیّا! شروع میں تو میرا ارادہ یہی تھا کہ چڑے چڑیوں کی کہانیوں سے آگے نہ بڑھوں لیکن آپ کی " گناہ کی راتیں " پڑھ کر نیّت خراب ہو گئی "

کسی مشاعرے میں حفیظ جالندھری اپنی غزل سنا تے سناتے چراغ حسن حسرت سے مخاطب ہو کر بولے۔

" حسرت صاحب! ملاحظہ فرمائیے! مصرع عرض کیا ہے۔

اور حسرت صاحب حفیظ صاحب کا مصرعہ سننے سے پہلے ہی نہایت بیچارگی سے کہنے لگے ـــــــ " فرمائیے حضرت! شوق سے فرمائیے، اپنی تو عمر ہی غزلوں کے مصرعے اٹھانے اور مُردوں کو کندھا دینے میں کٹ گئی ہے "

مشاعرہ کے سٹیج سکرٹری نے حضرت ولی شاہجہانپوری کو کلام سنانے کی درخواست کی تو اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ دلّی ہیں اور عاشقوں کے پہلو میں رہتے ہیں۔"

ولی صاحب اس کے جواب میں شعر پڑھنے سے پہلے کہنے لگے۔

"لیکن اب وہاں نہیں بلکہ معشوقوں کی مٹھیوں میں رہتا ہوں۔"

ہندوستان کے ایک مشاعرے میں پہلے شام کے وقت بہت سے شعراء نہر کی سَیر کرنے نکلے اتفاق سے نہر میں دو کشتیاں موجود تھیں۔ ایک پر منتظم مشاعرہ کے ساتھ تاجور نجیب آبادی، سیماب اکبر آبادی اور ساغر نظامی سوار ہوگئے اور دوسری صرف یاسؔ کے حصّہ میں آئی۔

ان دنوں تاجور اور یاسؔ کی چشمک زوروں پر تھی۔ تاجور نے یاس کو چھیڑنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"صاحب، ہم تو سوشل آدمی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں جماعت کے قائل ہیں، یہاں تک کہ کشتی میں بھی بیٹھتے ہیں تو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر۔"

یاس کے کانوں میں جب ان الفاظ کی بھنک پڑی تو انہوں نے تلملا کر اپنا ایک شعر پڑھ دیا ؎

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں

میرے حال پر دُنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

یاسؔ چنگیزی کسی مشاعرے میں اپنی غزل سناتے سناتے جب مقطع پڑھنے لگے۔

پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیش عقرب کیا

تو کسی من چلے نے پہلے مصرعہ میں ترمیم کرتے ہوئے کہنا شروع کیا ؂

میرزا یگانہ خود موذیوں کے موذی ہیں
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیش عقرب کیا

راولپنڈی کے ایک مشاعرے کے لئے لاہور سے کچھ شعراء کو مدعو کرنے لئے گلزار نسیم حضرت احسان دانش سے ملے۔

انہوں نے سوال کیا۔ "آپ کتنے پیسے دے سکیں گے ؟"

گلزار نے کہا۔ "آپ کو تین سو روپے دیئے جا سکیں گے" یہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ ہے" اسی رقم کو قبول فرماتے ہوئے خان بہادر حفیظ جالندھری نے بھی شمولیت کا وعدہ فرمایا ہے۔"

"حضرت! کہاں خان بہادر اور کہاں مزدور شاعر احسان! لیکن بندہ نواز میں اپنے مقام سے کسی قیمت پر نہیں گرنا چاہتا اور پانچ سو روپے سے ایک پائی کم نہ لونگا۔ میں بہت چھوٹا اور حفیظ صاحب لاکھ بڑے شاعر سہی لیکن یاد رکھئے' دودھ کتنی مفید اور عمدہ شئے ہے' لیکن گلی گلی میں فروخت ہوتا ہے اور شراب انتہائی بدنام اور مہلک ہونے کے باوجود اپنے مقام ہی پر بکتی ہے۔

شوکت تھانوی اور وصل بلگرامی ایک ساتھ کہیں سفر کر رہے تھے۔ کانپور سٹیشن پر ایک یوریشین حسینہ کو دیکھ کر شوکت نے کہا "وصل صاحب! آپ اتنے بڑے فنکار ہیں کہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں، لیکن اس حسینہ کا بوسہ لے سکیں تو بات ہے۔"

وصل صاحب نے چند لمحوں تک اپنی داڑھی کو کھجاتے ہوئے تامل کیا اور پھر ایک دم بوسہ لینے کے بعد چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔

"ہائے میری نورِ نظر زُہرہ بھی ہو بہو اسی شکل وصورت کی تھی مرحومہ کے بھی ایسے ایسے ہی خدوخال تھے اور ایسی ہی چال ڈھال تھی۔"

وہ حسینہ سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی، دوسرے لوگ بھی یہ منظر دیکھ کر وہاں اکٹھے ہو گئے اور بالآخر سب نے وصل صاحب سے ہمدردی کرنے کے بعد انہیں وہاں سے بھیج دیا۔

ساحر لدھیانوی کے کسی دوست نے اس سے کہا "یار ساحر اب تو تمہاری زندگی ہر اعتبار سے آسودہ ہے، اب تمہیں شادی کر لینی چاہیئے۔"

ساحر نے غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

"چاہتا تو میں بھی ہوں، لیکن کسی ایسی خاتون کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جو کنواری ہونے کے ساتھ ساتھ انٹیلکچوئل بھی ہو، لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ دونوں صفات ایک ہی وقت میں کسی ایک لڑکی میں نہیں ملتیں، یا تو وہ کنواری ہوتی ہے یا انٹیلکچوئل۔"

کسی مشاعرے میں سردار جعفری اپنا کلام سنانے سے پہلے کہنے لگے۔

"حضرات! میں عاشقانہ رنگ میں کچھ اشعار عرض کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ میرا اصلی رنگ

نہیں ہے"۔ جگن ناتھ آزاد نے سردار کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
" تو کیا آپ کا اصلی رنگ معشوقانہ ہے؟"

اُردو ادیبوں کی ایک محفل میں مولانا عبدالحق کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب کھانا کھاتے کھاتے اپنی انگلیاں چاٹنے لگے۔ جب چٹخارے لے لیکر اپنی انگلیاں چاٹ چکے تو مولانا نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا یعنی انگلیاں ان کے منہ کے قریب لاکر کہنے لگے ۔۔۔ " لیجئے حضرت! اب انہیں بھی صاف کر دیجئے"

دو ادیب آپس میں بحث کر رہے تھے، ایک کہہ رہا تھا شاعر اور ادیب کو ہمیشہ اپنی چشم دید چیزوں ہی کے متعلق لکھنا چاہیئے، ورنہ اس کا ادب حقیقت سے دُور ہوگا۔ ساحر لدھیانوی نے یہ بات سُنی تو مسکرا کر کہا۔
" میرا چشم دید تجربہ ہے کہ اُردو ادیبوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی"۔
وُہ ادیب صاحب ساحر کی طرف دیکھنے لگے تو ساحر نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ " اُردو میں صرف دو ہی چیزیں کام کی لکھی گئی ہیں کہانیوں میں قحطِ بنگال کے متعلق کرشن چندر کی کہانی " ان داتا " اور نظموں میں ساحر لدھیانوی کی نظم " تاج محل"۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ کبھی کرشن چندر بنگال میں گئے ہیں اور نہ میں نے ابھی تک تاج محل دیکھا ہے"۔

مجنوں گورکھپوری سے ایک پڑھے لکھے لیکن قدامت پرست بزرگ نے ایک بار

طنزاً دریافت کیا۔
"کیوں مجنوں صاحب! یہ آپ کا ترقی پسند ادب کس عنقائے مغرب کا نام ہے؟"
"مجنوں صاحب چیں بجبیں ہونے کی بجائے سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔
"کیوں قبلہ! خیر ترقی پسند ادب بھی کوئی جانور ہے؟"

ـــــــــــ

گرمی کے موسم میں کوئی نوعمر ادیب عبدالمجید سالک سے ملنے اُن کے پاس آئے۔
سالک صاحب کے کمرے میں بجلی کا پنکھا چل رہا تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی
ہوئی تھی اور ہر چیز قرینہ اور نفاست سے رکھی ہوئی تھی وہ ادیب کمرے کی شاداب
فضا سے متاثر ہو کر کہنے لگا۔
"سالک صاحب! آپ نے تو اپنے کمرے کو بالکل جنت بنا رکھا ہے۔"
سالک صاحب نے فوراً جواب دیا۔
"نہیں صاحب! آپ کے آنے سے پہلے اس جنت میں غلمان کی کمی تھی۔"

ـــــــــــ

کسی نے چراغ حسن حسرت سے کہا۔
"منٹو نے آپ کے بارے میں لکھا ہے، آپ تو محض ایک لغت ہیں جس میں مشکل الفاظ
کے معنے دیکھے جا سکتے ہیں۔"
حسرت نے تلملا کر جواب دیا۔
"اور منٹو ایک فحش ناول ہے جس کے مطالعہ سے جنسی مریض اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔"

ـــــــــــ

مجروح سلطان پوری نے ساحر لدھیانوی سے برہم ہوتے ہوئے کہا۔
"یاد رکھو ساحر! جب تم مرجاؤ گے تو اُردو کا کوئی ترقی پسند ادیب تمہارے جنازہ کے ساتھ نہیں جائے گا"
ساحر نے اپنے چیچک زدہ چہرے کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"مجھے اس کا کوئی غم نہیں، لیکن میں پھر بھی ہر ترقی پسند ادیب کے جنازے میں شریک ہوں گا"

چند بے تکلف شعراء میں پیروڈیوں کا ذکر ہو رہا تھا، ایک صاحب کہنے لگے۔
"پیروڈیوں میں اصل لطف یہ ہے کہ اصل شعر میں معمولی سے تصرف کے بعد مزاح پیدا کیا جائے"
قتیل شفائی نے یہ سُنا تو بولے۔
"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں، پیروڈی میں ایک آدھ لفظی ترمیم سے ہی نئی بات پیدا کرنی چاہیئے، عدم کا ایک شعر ہے ؎

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

میں نے اس کی پیروڈی کی ہے ؎

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

یہ شعر سُن کر سبھی شاعر کھلکھلا کے ہنس دیئے لیکن چند لمحوں بعد ایک شاعر قتیل صاحب سے مخاطب ہو کر گویا ہوئے ۔ ؎

"قتیل صاحب! آپ کا ایک شعر ہے ؎

اڑتے اڑتے اُس کا پنچھی دُور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے اس کی پیروڈی کی ہے، لیکن ایک کی بجائے دو لفظوں میں ترمیم کی ہے۔

اڑتے اڑتے اُس کا پنچھی دُور افق میں ڈوب گیا ؎
روتے روتے بیٹھ گئی آواز قتیلؔ شفائی کی

عبدالمجید سالکؔ کو ایک بار کسی جل جلے نے لکھا۔

"آپ اپنے رسالہ میں گمراہ کن خبریں چھاپتے ہیں اور عام لوگوں کو بیوقوف بناکر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں"

سالکؔ صاحب نے نہایت حلیمی کے ساتھ جواب دیا۔

"ہم تو جو کچھ لکھتے ہیں ملک و قوم کی بہبودی کے جذبہ کے زیر اثر لکھتے ہیں اور اگر ہزاروں قارئین میں آپ جیسا ایک آدمی بھی ہمارے کسی مضمون سے متاثر ہو کر نیک راہ اختیار کرلے سمجھیں گے ہمارا اُلو سیدھا ہوگیا"

بسملؔ شاہجہانپوری اپنی ریش مبارک کو کھجاتے ہوئے نوریش کمار شاد سے کہنے لگے۔

"صاحب! میں اپنا دیوان چھپوا کر شائع کرانا چاہتا ہوں، لیکن پریشانی یہ ہے کہ اس کیلئے مناسب نام نہیں سوجھ رہا۔ اپنے تخلص کی رعایت سے مجموعہ کا نام رکھنا چاہتا ہوں، جیسے فانیؔ بدایونی کے مجموعہ کا نام "باقیات فانی" ہے، محمودؔ دہلوی کے مجموعہ کا نام

" بادۂ مخمور" ہے، جوشؔ ملسیانی کے مجموعہ کا نام " بادۂ سروش " ہے۔"
شادؔ نے نہایت نیازمندی سے دریافت کیا۔
" تو اس لحاظ سے آپ کی کتاب کا نام " مرغِ بسمل " کیسا رہے گا؟"

نظمِ معرّیٰ کی مذمت کرتے ہوئے آقا بیدار بخت نے کہا۔
" قافیہ کی اہمیت ناگزیر ہے۔ قافیہ سے شعر میں صوتی حسن پیدا ہوتا ہے اور قافیہ ایک طرح سے شعر کا زیور ہے۔"
قیوم نظرؔ نے یہ سُنا تو کہنے لگا۔
" لیکن ـــــ نہیں محتاجِ زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔"

نواب سائلؔ اور مولانا بیخودؔ ایک مشاعرے میں اکٹھے نہیں پڑھتے تھے۔ اتفاق سے ایک جگہ یہی دونوں اساتذہ رہ گئے۔ مولانا بیخودؔ اپنی غزل نکال کر پڑھنے لگے کہ نواب سائلؔ نے انہیں روکا اور کہا۔
" دیکھو یہ بدتمیزی نہ کرو۔"
بیخودؔ نے انہیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے غزل جیب میں رکھ لی اور بولے۔
" اچھا تم بدتمیزی کرو۔"

نیاز فتح پوری نے مشاعروں کا مذاق اُڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایک دعوت نامے میں لکھا تھا ـــ " سامعین کو معزز جگہ دی جائے گی " جس سے میں یہ سمجھا کہ شاعروں کو جو جگہ

دی جائے گی، وہ غیر معزز ہوگی اور جب شاعر نے سامعین کی توجہ دلانے کے لئے کہا کہ
حضرات زبان دیکھئے! تو میں یہ سمجھا کہ اب یہ منہ کھول کر زبان دکھائیں گے

ہندوستان کے ایک مشاعرے میں نور میرٹھی کے بعد مولانا انور صابری نے اپنا کلام سنانا تھا' گوپی ناتھ امن نے نور صاحب کی غزل کا یہ مصرعہ دُہراتے ہوئے مولانا کو بلایا

ع اب ان کا زمانہ ہے اب ان کی جوانی ہے

مولانا سٹیج پر تشریف لائے اور امن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ع

اب ان کا بڑھاپا ہے اور میری جوانی ہے

ایک مشاعرے میں ایک نومشق صاحبزادے نے ایک غزل سنائی جس میں بیشتر مصرعے بسمل سعیدی کے تھے۔

جب بسمل سعیدی صاحب اپنی غزل پڑھنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا۔

"اب میں اپنے کہے ہوئے اشعار خود سنا رہا ہوں"

لفظ "خود" پر بہت داد ملی۔

شعر خوانی سے قبل شعرا حضرات کرسیوں پر بیٹھے تھے، مشاعرہ شروع ہونے سے قبل یہ فیصلہ ہوا کہ فرشی نشست ہو، چنانچہ گوپی ناتھ امن نے شعرا کو کرسیوں پر سے فرش پر بلاتے ہوئے کہا

"حضرات! اب اہلِ فن کا زوال ہو رہا ہے"

ایک سرکاری افسر صدر مشاعرہ تھے اور نوح ناروی مرحوم اپنا کلام سنا رہے تھے صدر مشاعرہ حیرت اور غور سے نوح کا کلام سن رہے تھے، جب اپنا کلام سنا چکے تو صدر مشاعرہ اپنی افسرانہ شان کے ساتھ اُٹھے اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"نوح صاحب! خوب!! مجھے حیرت ہے کہ آپ غیر ملکی ہونے کے باوجود اُردو زبان میں اتنی اچھی شاعری کر لیتے ہیں"

نوح صاحب کا منہ حیرت سے کھُل گیا "جی کیا فرمایا؟ غیر ملکی؟"

صدر مشاعرہ نے اُفسرانہ معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

"جی ہاں! غیر ملکی!! ناروے کے رہنے والے ہیں نا آپ؟ ایک ناروی کا اُردو میں اتنی اچھی شاعری کرنا بھئی کمال ہے"

ایک محفل میں قیوم نظر نے یوسف ظفر کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوتے کہا۔ "کاش آپ اتنے بیوقوف ہوتے کہ میرے تمام گیت لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے"۔ یوسف ظفر نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا "کاش میں اتنا بیوقوف ہوتا"

ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ چھوکرے نے یوسف ظفر کی غزل پر اعتراض کیا کہ "اشعار بے جان ہیں"

آپ نے چمک کر فرمایا۔ "میں شاعر ہوں، ابن مریم نہیں کہ مُردہ اشعار میں روح پھونک سکوں"

ایک مشاعرے کے دریمان جب وقفہ ہوا اور شاعروں کو چائے پیش کی جانے لگی تو حامد شاہجہان پوری کے بچے نے کہا۔ "بس خالی چائے"
حامد صاحب نے انہیں آنکھ سے منع کیا تو بولا۔
" اتنا پیچھے اتنا پیٹے اور بس ایک پیالی چائے، کیا گھر پر آپ کو نہیں ملتی چائے؟

کرنل مجید نے ایک بار پطرس بخاری سے کہا۔
اگر آپ اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام "صحیح بخاری" رکھیں۔
پطرس مرحوم نے جواب دیا۔
"اور اگر آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام "کلام مجید" رکھیں۔

ایک دفعہ شوکت تھانوی سخت بیمار پڑے یہاں تک کہ ان کے سر کے بال جھڑ گئے دوست احباب ان کی عیادت کو پہنچے اور بات چیت کے دوران میں ان کے گنجے سر کو بھی دیکھتے رہے، سب کو متعجب دیکھ کر شوکت تھانوی بولے۔
" ملک الموت آئے تھے، صورت دیکھ کر ترس آگیا بس صرف سر پر ایک چپت رسید کر کے چلے گئے"

علامہ کیفی کو ایک صاحب نے پان پیش کیا، اس وقت کیفی صاحب مصنوعی دانت نہیں لگائے تھے، انہوں نے پان لینے سے معذرت کی اور کہا۔
" اس وقت پان کھانے کی مشین نہیں ہے"

احمق پھپھوندوی ایک مشاعرے میں بلائے گئے جس میں بہت سے شاعران کی پسند کے نہ تھے، انہوں نے اپنے تخلص کا سہارا لے کر یہ مقطع پڑھا ـــ

ادب نوازیٔ اہلِ ادب کا کیا کہنا

مشاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں

پطرس بخاری کی موجودگی میں اُردو کے دو مشہور شاعر آپس میں بحث کر رہے تھے کہ شعر میں " اعلانِ نون" جائز ہے یا نہیں؟

دیر تک بحث مباحثہ کے بعد جب وہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو پطرس نے کہا۔

" اگر واقعی آپ حضرات نون کے اعلان کے خلاف ہیں تو ازراہِ کرم "اعلانِ نون" کی بجائے "اعلانِ نوں" کہئے "

اختر شیرانی کو شراب پیتے دیکھ کر ان کے ایک زاہد دوست نے نصیحت فرمائی،

"خدا کیلئے پیتے ہوئے اس خانہ خراب میں سوڈا یا پانی ملا لیا کیجئے" اس طرح پینے سے دل جلتا ہے" اختر نے نیٹ پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"مولانا! اللہ بہتر جانتا ہے کہ میرے اس طرح پینے سے درصل کس کا دل جلتا ہے"

اختر شیرانی شراب کے نشہ میں دھت تھے کہ اچانک ساحر لدھیانوی اور شورش کاشمیری مل گئے۔ ساحر نے نہایت عقیدت سے اختر کو سگرٹ پیش کیا تو اختر صاحب سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے جھوم کر بولے۔

" مجھے دو چیزوں سے بے حد پیار ہے "

ساحر اور شورش ہمہ تن گوش ہو گئے، اور اختر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

" س اور ش سے ۔۔۔ س یعنی سگرٹ اور ش یعنی شراب" اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے عقیدت مندوں کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

" اور صرف یہی نہیں، س یعنی ساحر اور ش یعنی شورش بھی"

مولانا تاجور نجیب آبادی کے ایک شاگرد نہایت پُرگو تھے، ایک ایک دن میں چار چار غزلیں اصلاح کے لئے مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔

ایک روز گھبرائے ہوئے سے آئے اور مولانا سے کہنے لگے۔

" حضرت علامہ! غضب ہو گیا میری غزلوں کی بیاض کسی نے چُرا لی ہے "

مولانا تاجور نجیب آبادی اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگے۔

" عزیزم! جس نے بھی یہ کارِ خیر سرانجام دیا ہے اس نے پوری اُردو شاعری پر احسانِ عظیم فرمایا ہے "

میڈم نورجہاں کسی بنک میں گئیں اور چیک کاٹنے کے لئے انہیں قلم کی ضرورت پیش آئی، اتفاق سے وہاں اشرف صبوحی صاحب موجود تھے، انہوں نے اپنا قلم پیش کیا، چیک لکھ کر میڈم جب دستخط کرنے لگیں تو انہوں نے وہاں لکھا۔

" نورجہاں بقلم خود" ۔۔۔ صبوحی صاحب فوراً بول اُٹھے۔

" میڈم! بقلم صبوحی لکھئے!

قلم تو آپ میرا استعمال کر رہی ہیں اور لکھتی ہیں۔ "بقلم خود"۔

حکیم محمد سعید دہلوی لاہور آنے کے لئے کراچی کے ہوائی اڈے پر کھڑے طیارے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشرف صبوحی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب کو بیت الخلاء کی ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے صبوحی صاحب سے کہا کہ۔

" ذرا سامان کا خیال رکھیئے میں پیشاب کر آؤں "

صبوحی صاحب چہک کر بولے۔

" حکیم صاحب! اتنی پریشانی بھی کیا؟ جس خُدا نے آپ کو فارغ البال بنایا ہے، وہی آپ کو فارغ البول بھی کر دے گا"

یاد رہے کہ بالوں کے سلسلے میں حکیم صاحب واقعیؔ "فارغ البال" ہیں۔

آغا شورش کاشمیری ایک بار غسل کر رہے تھے، اتنے میں کوئی ملاقاتی آیا۔ آغا صاحب رات بھر لکھ لکھ کر تھکے ہوئے تھے اور غسل کر کے سوجانا چاہتے تھے اسلئے ملازم نے غسل خانے کے کواڑ سے منہ لگا کر کہا کہ آغا صاحب! کہیں باہر سے کوئی صاحب ملاقات کے لئے آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مجھے جلد واپس جانا ہے، دیر ہوگئی تو گاڑی نکل جائیگی"

شورش کاشمیری کو اپنے مہمان کا اس قدر خیال آیا اور اس خیال میں اس قدر بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ کپڑے پہننے کا بھی خیال نہ رہا، اور ننگے ہی تولیہ کاندھے پہ ڈالے غسل خانہ سے باہر نکل آئے۔

ملاقاتی حیران ہوگیا، نوکر نے اشارے سے عریانی کی طرف توجہ دلائی تو وہ

بھاگ کر دفتر میں جا گھسے اور کمرے میں جا کر نوکر سے کپڑے منگوائے اور مہمان سے معافی مانگی۔ مہمان جو اس واقعہ سے دم بخود ہو گیا تھا، کہنے لگا۔

" یہ بھی تو اک ادائے قلندری ہے "

اور حاجی لق لق کو تو ہم جانتے ہیں، وہی! جس کے پینے سے بھی شراب کی بُو آتی تھی وہی! " زمیندار" کا کالم نویس، ایک شام جب وہ اپنے دفتر سے اُٹھنے ہی والا تھا۔ کہ ایک بے تکلف دوست آ گیا۔

" کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں ؟"

لق لق نے ان الفاظ کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

اس نے اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے بتایا۔

" ڈیڑھ روپے کے لگ بھگ ——"

لق لق کی باچھیں کھل گئیں۔

" تو حل ہو گیا مسئلہ —— ایک روپیہ میرے پاس بھی ہے "

" لیکن اس سے کیا ہو گا "

" ٹھرّے کا ایک پوّا لے کر پیئیں گے "

" ایک پوّے سے دو آدمی ——؟

" ارے میاں! اتنا نشہ تو ہو جائیگا کہ فلاں رسالہ کے مالک سے پینے کے لئے دوبارہ پیشگی مانگتے ہوئے شرم محسوس نہ ہوگی "

پروفیسر اولاد احمد صدیقی کی شادی ہوگئی تو ان سے احمد جمال پاشا نے ایک دن پوچھا۔ "جب آپ اپنی بیوی کو خط لکھیں گے تو ——
" آپ کا اولاد —— یا آپ کی اولاد لکھیں گے —— ؟

جناب آشفتہ لکھنوی کے دروازے پر کسی خوش آواز فقیر نے صدا لگائی اور کوئی شعر پڑھا۔

آشفتہ صاحب کے خورد سالہ بھانجے نے اس سے کہا۔
" ٹھہرو ! میں ماموں جان کو مطلع کرتا ہوں"
اندر جاکر آشفتہ صاحب سے کہا "کوئی صاحب آپ کو باہر بلاتے ہیں ؟"
آشفتہ صاحب نے کہا۔ " نام تو پوچھا ہوتا "
" کوئی شاعر ہے' آپ کے دھوکے میں مجھ کو غزل سنانی شروع کردی "

مولانا ظفر علی خاں رحمۃ اللہ کے بارے میں چراغ حسن حسرت کا خیال تھا کہ وہ خوب موٹے تازے ہوں گے، مگر جب انہیں دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی' اس کی وجہ حسرت صاحب نے یہ بتائی کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر ورزش کرتے اور میلوں تک پیدل دوڑتے چلے جاتے ۔ ایک مرتبہ آپ صبح ہی صبح کہیں ورزشی دوڑ لگا رہے تھے کہ ایک پولیس والے کو کچھ شبہ ہوا اس نے آواز دی تو مولانا کو دل لگی سوجھی' اور سرپٹ دوڑ۔ کھڑے ہوئے' اب سپاہی پیچھے پیچھے اور آپ آگے آگے ایک جان لیوا دوڑ دھوپ کے بعد جب وہ آپ کے پیچھے دفتر" زمیندار" میں داخل

ہوکر آپ کو پہچان پایا تو بے چارے کو خاص بادوسی ہوئی کہنے لگا "مولانا ! آپ اگر وہیں رُک کر اپنا تعارف کرا دیتے تو مجھے یہ بے دہر کی تکان نہ جھیلنا پڑتی" مولانا یہ سُن کر مسکرا دیئے۔

٭٭٭٭٭

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری مرحوم ایک انگریز افسر سے ملنے گئے۔ افسر کی سیکرٹری کوئی نک چڑھی خاتون تھی' اس کے اور پطرس کے درمیان جو مکالمت ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

" آپ کا نام ؟"

" احمد شاہ پطرس بخاری "

" کیا کرتے ہیں ؟"

" ریڈیو میں ڈائرکٹر جنرل ہوں "

" صاحب سے کبھی پہلے بھی ملے ہو ؟"

" جی نہیں "

" اچھا کل آنا "

اور پطرس واپس لوٹ آئے' اگلے روز پھر بعینہٖ وہی باتیں ہوئیں اور سیکرٹری صاحبہ نے کل آنے کا مشورہ دیا' تیسرے دن پطرس نے جاتے ہی کہا'

" میرا نام پطرس بخاری ہے' ریڈیو میں ڈائرکٹر جنرل ہوں' صاحب سے پہلے کبھی نہیں ملا اور اب میں کل آؤں گا "

سیکرٹری صاحبہ یہ سُن کر مسکرا دیں اور صاحب سے پطرس کی ملاقات کا

بندوبست کرا دیا

انجمن ترقی پسند مصنفین کے توڑ پر "اسلام پسند مصنفین" اور "تعمیر پسند مصنفین" کے نام سے دو انجمنیں قائم ہوئیں، چراغ حسن حسرت نے جب سُنا کہ "انجمن مصنفین" کے نام سے ایک اور انجمن بن رہی ہے" تو کہنے لگے۔

"ہمارے خیال میں ترقی پسند، اسلام پسند اور تعمیر پسند جیسے ناموں کے مقابلہ میں انجمن مصنفین بہت کم حیثیت سا نام معلوم ہے، اس سے تو اچھا ہے کہ اس انجمن کا نام فقط مصنفین رکھ دیا جائے۔

روزنامہ "امروز" کراچی میں ایک مراسلہ چھپا جس کا عنوان تھا "آواز دو انصاف کو، انصاف کہاں ہے"؟

لاہور کے "امروز" میں چراغ حسن حسرت نے "حرف و حکایت" کے کالم میں اس کے جواب میں لکھا۔

"حضرت! اگر انصاف کراچی میں نہیں تو لاہور میں بھی تو نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بیچارا انصاف گرمی کا موسم گزارنے مری چلا گیا ہے، آخر وہ بھی کیا کرے؟ لاہور والے بھی اسے آوازیں دے رہے ہیں، کراچی میں بھی لوگ اسے دم بھر کے چین نہیں لینے دیتے، ذرا نظروں سے اوجھل ہوا اور شور مچ گیا کہ آواز دو انصاف کو، انصاف کہاں ہے؟ اسلئے اگر وہ چھٹی منانے مری چلا گیا ہے تو آوازیں دے دے کر اسے پریشان تو نہ کیجئے۔

شاہد احمد دہلوی پاکستان میں آکر کراچی ریڈیو سے گانا نشر کرنے لگے تھے اور موسیقی کے سبق بھی نشر کیا کرتے تھے۔ حکومت نے قومی اصلاح کی غرض سے حکم جاری کیا کہ پروگراموں کے درمیانی وقفوں میں مختلف قسم کے اقوال نشر کئے جائیں، مثلاً جھوٹ مت بولو، تھوکئے نہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک شام شاہد گا رہے تھے، گانا ختم ہونے پر اناؤنسر کی آواز سنائی دی: "ابھی ابھی شاہد احمد حفیظ جالندھری کا کلام سنا رہے تھے" اور اسکے ساتھ ہی یہ مقولہ نشر ہوا "فحش کلامی سے پرہیز کیجئے"!

یہ اناؤنسر مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے صاحبزادے تھے اور جب شاہد کو اس اتفاقی مذاق کا پتا چلا تو کہنے لگے ۔

" کاش! اس برخوردار نے یہی نصیحت اپنے بزرگوار کو کی ہوتی "!

اناؤنسر صاحب نے یہ مشورہ مانا یا نہیں تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس حادثے کے بعد اقوال کو نشر کرنے کا دستور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

ایک محفل میں جہاں راقم الحروف بھی شریک تھا، مقبول جہانگیر نے سید عطرت زیدی کی وفات کی خبر سناتے ہوئے احسان دانش سے کہا کہ

"جوش صاحب تو ضرور اس کے جنازے پر آئے ہوں گے؟" اس پر احسان صاحب چہک کر بولے "اونہہ! وہ شخص تو اپنے جنازے پر نہ آئیگا عطرت کے جنازے پر اُسے کیا خاک آنا ہے؟"

اسی محفل میں کسی جھوٹے شخص کا ذکر چھڑا تو احسان دانش فرمانے لگے۔
" اجی اُس کی کیا بات کرتے ہیں ؛ وہ شخص تو صرف اتنا جھوٹ بولتا ہے، جتنا نمک میں آٹا!" اور ساری محفل اس نئی ترکیب " نمک میں آٹا" کو سن کر کشتِ زعفران بن گئی۔

ایک بار اشرف صبوحی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے، وہاں انہوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی، جو کسی الماری میں مقفل تھی، حفیظ صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔
" بیگم! ذرا چابی دینا! ایک کتاب نکالنا ہے۔"
اس پر صبوحی صاحب چہک کر بولے۔
" ہاں ہاں! ضرور چابی دیجئے، انہیں! یہ بھی اب جاپانی کھلونا بن گئے ہیں، چابی کے بغیر نہیں چل سکتے۔"

پھول، پتھر

جس میں وقت کی دھڑکن بھی ہے اور نبض کی جنبش بھی ناول وافسانے کی مشہور ناقد ڈاکٹر میمونہ انصاری کی اپنی تخلیق جس پر مصنفہ کی ایک ناقدانہ گرفت ابتدا سے انتہا تک رہی ہے۔ وقت کے دریا کو کوزے کرنے کی ماہرانہ کوشش، نزاکتِ خیال، احساس وجذبات کی رنگینی، اظہار وابلاغ کی سادگی، زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتیں جن سے آنکھیں نم بھی ہو جائیں اور اجتماعی وقومی اخلاق کی کج روی سے قاری شرمندہ وپشیمان بھی ہو جائے۔

پلاٹ فن کاری کا نمونہ ● مکالمے حسن تکلم کی مثال ● احساسات کے گلہائے رنگیں ● نوعِ انسانی کا المیہ ● جذبات کا گداز ● ناول کے اندر تغزل ● مدت کے بعد اردو ادب میں اعلےٰ درجے کا ناول لکھا گیا ہے۔

لکھائی چھپائی اعلےٰ

مکتبہ میری لائبریری لاہور